اسلام اور ردِّ مغرب

مغربی تہذیب خلافِ اسلام ہے اور اس کا ردّ شرعاً واجب ہے

ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرہان، لاہور

اسلام اور ردِّ مغرب

مغربی تہذیب خلافِ اسلام ہے اور اس کا ردّ شرعاً واجب ہے

ڈاکٹر محمد امین

پروفیسر علوم اسلامیہ، یونیورسٹی آف لاہور

مکتبہ البرہان، لاہور

نام کتاب	مغربی تہذیب خلافِ اسلام ہے اوراس کا ردّ شرعاً واجب ہے
مؤلف	ڈاکٹر محمد امین
سن اشاعت	اپریل ۲۰۲۰ء
ناشر	مکتبہ البرہان، لاہور

مشمولات
ایک نظر میں

فہرست مضامین

پیش لفظ

اگرچہ علوم اسلامیہ کی تحصیل میں ہمارا ایک تخصص فقہ واصولِ فقہ کا بھی تھا لیکن اس کے باوجود ہمارا اسلوب کبھی بھی فتوے کا نہیں رہا بلکہ ہم شائستہ انداز میں دلیل سے بات کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر فریق مخالف کے دلائل کا بھی ذکر کرتے ہیں اور دلیل و برہان ہی سے ان کا جواب بھی دیتے ہیں۔

زیر بحث کتابچے میں بھی ہمارا یہی اسلوب رہے گا، ان شاء اللہ۔ البتہ ہم نے اس کا عنوان ایسا رکھا ہے کہ علماء کرام اور دیگر پڑھے لکھے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور ملک کے پڑھے لکھے اور دینی سوچ اور مزاج رکھنے والے لوگوں کو اس موضوع کی نزاکت کا احساس ہو اور ان کی یہ غلط فہمی دور ہو کہ مغربی فکر و تہذیب کے رد و قبول کا مسئلہ ایک سماجی اور تہذیبی مسئلہ ہے اور یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم اس تحریر میں یہ بات دلائل کے ساتھ اور وضاحت کے ساتھ ان کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک شرعی مسئلہ ہے جس کا ہماری دنیا اور آخرت سے گہرا تعلق ہے۔

اس سے پیشتر اسلام اور مغربی تہذیب کے حوالے سے ہماری دو کتابیں ''اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش'' اور ''اسلام اور مغربی فکر و تہذیب میں تصورات و اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ'' کے نام سے مارکیٹ میں موجود ہیں اور اس موضوع پر پڑھنے اور سوچنے والوں کو فکری لوازمہ مہیا کرتی ہیں۔ اللہ کرے یہ تازہ تحریر بھی کچھ لوگوں کی صحیح رخ میں ذہن سازی میں ممد و معاون ہو، امت کے لیے مفید ثابت ہو اور ہمارے لیے توشۂ آخرت۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

لاہور، یکم مارچ ۲۰۲۰ء — محمد امین

باب اول

مغربی تہذیب کے قابل ردّ ہونے کے شرعی و عقلی دلائل

مغربی تہذیب کے قابل ردّ ہونے کے شرعی وعقلی دلائل

جب ہم بات ہی اس ادعا سے شروع کر رہے ہیں کہ مغربی تہذیب خلاف اسلام ہے اور اس کا ردّ شرعاً واجب ہے تو قاری کے ذہن میں اس سوال کا پیدا ہونا فطری اور منطقی ہے کہ ہمارے پاس اس کے دلائل کیا ہیں؟ ہم نے آئندہ سطور میں اس کے لیے درج ذیل نو (۹) دلائل پیش کیے ہیں جن میں سے بعض قرآن وسنت سے مشتق ومستنبط ہیں اور بعض مقاصد شریعت کو پورا کرنے والے اور عقل عام کا تقاضا ہیں:

پہلی دلیل: مغربی تہذیب کفر والحاد پر مبنی ہے

دوسری دلیل: مغربی تہذیب 'دین غیر اللہ' ہے

تیسری دلیل: مغربی تہذیب کے علمبردار اسلام اور مسلم دشمن ہیں

چوتھی دلیل: مغربی تہذیب کے علمبردار اپنے غلبے اور اسلام اور مسلمانوں پر بالادستی کے خواہاں ہیں

پانچویں دلیل: مغربی تہذیب اور اس کے علمبردار مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کے لیے کوشاں ہیں

چھٹی دلیل: مغربی تہذیب اور اس کے علمبردار مسلم زوال کا سبب بنے

ساتویں دلیل: مغربی تہذیب اور اس کے علمبردار مسلم زوال کے تسلسل میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں

آٹھویں دلیل: مغربی تہذیب اور اس کے علمبردار مسلمانوں کی ترقی واستحکام میں مزاحم ہیں

نویں دلیل: یہ مسلمانوں میں احساس زیاں کے خاتمے اور بے حسی کے موجب ہیں

اور اب ان کی کچھ تفصیل۔

پہلی دلیل

مغربی تہذیب کفر والحاد پر مبنی ہے

اس سوال کا جواب دو پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے: **ایک یہ کہ** مغربی تہذیب جن بنیادی افکار پر کھڑی ہے وہ کفر والحاد پر مبنی اور اسلام سے متضاد ہیں ۔ **دوسرے یہ کہ** قرآن مشرکین وملحدین کے ساتھ اہل کتاب کو بھی کافر قرار دیتا ہے۔ ان پہلوؤں کو ہم نے دو مباحث میں تقسیم کیا ہے۔

مبحث اوّل: مغربی تہذیب کے اساسی افکار کفر والحاد پر مبنی ہیں

یہاں ہم پہلے ان بنیادی افکار کا ذکر کریں گے جن پر مغربی تہذیب کھڑی ہے اور پھر ان کی تقسیم کرتے ہوئے اور اسلامی تعلیمات سے ان کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ ثابت کریں گے کہ یہ افکار قرآن وسنت سے متضاد اور ان کے خلاف ہیں:

مغربی تہذیب کے اساسی افکار

مغربی تہذیب کے تشکیلی اور اساسی افکار میں اگرچہ بہت سے نظریات اور ازموں (Isms) کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن ہم ان میں سے چند اہم کا ذکر کریں گے جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریلزم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم (Empiricism)۔ پھر ان افکار کے نتیجے میں بننے والے ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کا ذکر کریں گے اور پھر اسلامی تعلیمات سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے انہیں اسلام مخالف ثابت کریں گے، ان شاء اللہ۔

ہیومنزم (Humanism)

سادہ الفاظ میں ہیومنزم کا مطلب ہے وہ نظریہ جس میں انسان اور اس کی آزادی، اقدار اور خواہشات کو مرکزی حیثیت دی گئی ہو۔ چنانچہ اس نظریے کے آثار ہمیں یونانی فلسفے سے منتقل ہوتے نظر آتے ہیں۔ چودھویں صدی میں اس لفظ کا استعمال اطالوی ہیومنسٹ

Petrach نے کیا جس نے علوم انسانی (Humanities) کے حوالے سے قدیم لاطینی دانش کے احیاء کی کوششیں کیں۔ لیکن تحریک نشأۃ ثانیہ اور مغرب میں سائنسی طرز فکر کے غلبے کے بعد انیسویں اور بیسوی صدی میں اس نظریے میں ہمیں سیکولرزم اور دین دشمنی کے رجحانات غالب نظر آتے ہیں (گو بعض ایسے ہیومنسٹ بھی ہیں جو مذہب کی تردید نہیں کرتے)۔ رواں صدی میں ہیومنزم کا اظہار کئی صورتوں میں ہوا ہے۔ موجودیت (Existentialism) اور مظہریت (Phenomenology) بھی اسی کا پرتو ہیں۔ سائنٹفک ہیومنزم کے علمبردار مذہب کو دیس نکالا دے کو سائنسی علوم کے ذریعے فرد کی آزادی اور اس کی بہتری کے لیے کام کرنے کے دعوے دار ہیں۔ (عیسائی) مذہب میں یقین رکھنے والے جن دانشوروں نے ہیومنزم کا علم سنبھالا (جیسے ارونگ بابط [Irving Babbitt] اور جیکوز ماریتان [Jacques Maritain] انہوں نے خدا، چرچ، عبادت اور دعاء جیسی مذہبی اصطلاحات کو ان کے روایتی مفاہیم سے الگ کر کے انہیں نئے معانی پہنانے کی کوشش کی۔ [1] کیرک گرڈ، کارل جاسپرز اور جبریل مارسل نے بھی ہیومزم اور عیسائی مذہب کے درمیان تلفیق کی ناکام کوشش کی تاہم مارٹن ہائیڈ یگر اور ژاں پال سارتر نے کھلم کھلا ہیومزم کو الحادی رنگ دے دیا۔ ہائیڈ یگر کے نزدیک انسان ایک شے نہیں بلکہ ایسا وجود ہے جو صاحب اختیار ہے اور قوت فیصلہ رکھتا ہے۔ وہ انسان کو صداقت کا موجد بھی سمجھتا ہے اور انسان کے مقابلے میں خدا کا بھی قائل نہیں ہے۔

سارتر نے اپنی تالیف (*Existentialism as Humanisim*) میں ہیومنزم کا موجودیاتی تصور پیش کیا ہے۔ وہ ہیومنزم کو انسان دوستی کی بجائے انسان پرستی تک پہنچا دیتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے ''میرا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے انسانی کائنات کے کوئی کائنات نہیں ہے اور یہی ہمارا ہیومنزم ہے جس سے ہم انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ سوائے انسان کے کوئی اس

---

[1] Paul A.Kurz, Forbiddin Fruit: The Ethics of Humanism, P-108

کے یے قانون نہیں بنا سکتا۔ہم نے مذہب کو کھو دیا ہے لیکن ہیومنزم کو پالیا ہے۔اب اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو آزاد کرایا جائے اور اسے قادرِ مطلق سمجھا جائے۔ہم نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا ہے تا کہ وجودِ انسان وجودِ مطلق بن جائے۔''[1]

سارتر کی مابعد الطبیعیات کا ایک اہم تصور یہ ہے کہ کائنات میں کسی قسم کا نظم وتناسب موجود نہیں ہے۔اس میں جو توافق نظر آتا ہے وہ خود انسان کے ذہن کا دیا ہوا ہے۔وہ اس بات کا بھی قائل نہیں ہے کہ کائنات عدم سے وجود میں آئی ہے وہ خدا کے وجود کا منکر ہے اور اپنے فلسفے کو ملحدانہ ہیومنزم کا نام دیتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ خدا کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو انسان فاعل مختار نہیں رہتا۔اس کے خیال میں یا تو انسان فاعل مختار ہے،خدا کا محتاج نہیں ہے اور یا وہ خدا کا محتاج ہے اور مجبور ہے۔وہ پہلی شق کا قائل ہے۔وہ خدا کا اس لیے بھی قائل نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی ذی شعور ہستی کو تسلیم نہیں کر سکتا جو بیک وقت کائنات میں جاری وساری بھی ہو اور اس سے ماوراء بھی ہو جیسا کہ اہل مذہب کا ادعاء ہے۔وہ معروضی قدروں کا بھی منکر ہے اور کہتا ہے کہ انسان اپنی ضرورت اور مرضی سے اپنی اخلاقی قدریں خود تخلیق کرتا رہتا ہے۔اس وجہ سے سارتر کے نظام فکر میں کسی قسم کی ازلی وابدی صداقتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔[2]

سارتر کے ان اقوال کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ہیومنزم صرف انسان دوستی اور انسان نوازی نہیں بلکہ یہ خدا کی خدائی کا انکار اور فرد کی کبریائی اور الوہیت کے اثبات کا نام ہے۔یہ صرف وحی اور مذہب کی برتری کا انکار نہیں بلکہ خود اس کی جگہ لینے کا ادعاء بھی ہے۔

اسی طرح ولیم جیمز بھی کسی صداقت مطلقہ کا قائل نہیں ہے اور وجودِ مطلق یعنی خدا کو

[1] Jean Paul Sartre, Existentialism as Humanism, P-284

[2] Jean Paul Sartre, Being and Nothingness, P-122

''مابعدالطبیعی عفریت'' کا نام دیتا ہے[1] جبکہ نطشے (Nietzsche) کہتا ہے کہ خدا مر چکا ہے۔[2]

ہیومنزم وہ اساسی نظریہ ہے جو یورپ میں سولھویں صدی میں ابھر کر سامنے آیا اور جدید مغربی تہذیب کی بنیاد بنا اور دوسرے سارے نظریات (سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم....وغیرہ) اسی سے پھوٹتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہیومنزم کا منبع یونانی فکر وفلسفہ ہے جو اگرچہ انسانی عقل ودانش کا بہترین نمونہ ہے لیکن وحی کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے مذہبی حوالے سے منبع کفر وضلالت اور انسانی حوالے سے غیر فطری ہونے کی وجہ سے انسانی مسائل کا صحیح حل پیش نہیں کرسکتا۔ ہیومنزم کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ دین دشمن ہے اور اس وقت کی پاپائیت کو ردّ کر کے اس نے آگے بڑھنے کی راہ ہموار کی۔ ہیومنزم کی ابتدائی فکر اگرچہ یہ تھی کہ انسان کو کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کے بنیادی تصور میں سوچ کی یہ خرابی موجود تھی کہ انسان عاقل ہے، اسے اپنے فیصلے خود کرنے چاہئیں اور وہ کسی غیر مرئی بالادست ذات (یعنی اللہ) کی ہدایت کا محتاج نہیں ہے یہ سوچ بتدریج تناور درخت بن کر سامنے آئی اور اس کا آخری نتیجہ وہ تھا جو نطشے، ہائیڈیگر اور سارتر کے الفاظ میں سامنے آیا کہ خدا مر چکا ہے اور انسان آزاد وخود مختار ہی نہیں مختار مطلق ہے۔ وہ اپنا خدا خود ہے اور اسے کسی اور خدا کی ضرورت نہیں۔

ظاہر ہے ہیومنزم کے یہ سارے افکار کفر والحاد ہیں بلکہ ہیومنزم آسمانی مذہب اور دین کے مقابلے میں خود ایک دین، اور نظامِ حیات بلکہ آسمانی خدا کے مقابلے میں ایک خدا بن کر

---

[1] L. Zusne, Names in the History of Psychology, P-98

[2] Fredeick Nietzsche, *The Gay Science*, trans. & ed. Walter Kaufmann, (New York: Vintage, 1974) part III, sec. 125 (the Mad Man), 181.

سامنے آیا ہے۔

اس کے مقابلے میں اسلام ایک دین ہے جس کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ایک اللہ انسان کا خالق و مالک ورب ہے، وہ اکیلا ہادی، معبود اور مطاع ہے۔ انسان اللہ کی حقیر مخلوق اور عبد ہے اور اس کا کام بلا چوں و چرا، بلا شرط و حدود، اللہ کی عبادت و اطاعت کرنا ہے۔ اللہ کی عبادت و اطاعت کا یہ رویہ لغوی اور اصطلاحی لحاظ سے 'اسلام' ہے اور جو اس اسلام کو اپنا لے وہ 'مسلم' کہلاتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت اور اپنی عبد ہونے کی حیثیت کو نہ مانے وہ گویا اس کی الوہیت کا انکار کرنے والا یعنی کافر ہے۔ کافر عربی لفظ ہے جس کا معنی ہے انکار کرنے والا یعنی کافر اور ملحد وہ شخص ہے جو اللہ کی الوہیت اور اس کی ہدایت کے پیکج یعنی دین اسلام کا انکار کرے۔

اس وضاحت سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ ہیومنزم کفر و الحاد ہے۔ یہ خدا کا انکار اور اس کے مقابلے میں انسان کی خدائی کا اثبات ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہیومنزم اسلام سے متضاد ہے اور ہیومنزم کو ماننے والا کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

سیکولرزم (Secularism)

سیکولرزم کے مفاہیم انسان کی فکری تاریخ خصوصاً یونانی مفکرین کی تعلیمات کا حصہ رہے ہیں تاہم کہا جا سکتا ہے کہ اس نام کے بغیر اس کی ابتداء سولہویں صدی کے انگلستان میں اس وقت ہوئی جب وہاں سیاسی اقتدار مذہبی حلقوں سے سیاسی حلقوں کو منتقل ہوا اور فیصلے مذہبی عدالتوں کی بجائے سول عدالتوں میں ہونے لگے۔ تاہم اس تحریک کی ابتداء اس نام سے انیسویں صدی کے وسط میں انگلستان میں ہوئی۔ اس کا بانی جارج جیکب ہولیوک (Holyoake) تھا جو ۱۸۱۷ء میں برمنگھم میں پیدا ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں جب اس کا یقین خدا پر سے اٹھ چکا تھا، اسے مذہبی تعلیمات کی توہین کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا۔ وہ چونکہ اسے ناانصافی گردانتا تھا اس لیے اس وقت کے مذہبی، سیاسی اور اخلاقی نظام کے خلاف اس کے دل میں کدورت پیدا ہو گئی۔ اس کے ساتھیوں میں سے چارلس ساؤتھ ویل، براڈلے،

چارلس واٹ وغیرہ معروف ملحد تھے لیکن ہولیوک سیکولرزم اور الحاد کو مترادف نہ گردانتے پر اصرار کرتا تھا۔ [1] تاکہ مذہب کے ماننے والوں میں سے آزاد خیال لوگ اس کی تحریک شامل ہو سکیں۔

سیکولرزم کا فلسفہ یہ ہے کہ موجودہ دنیوی زندگی اور اس کی بہتری اور خوش حالی ہی ہمارا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ آخرت کی زندگی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں کیونکہ وہ ہمارے تجربے میں نہیں آئی۔ خدا اور مذہب اگر موجودہ زندگی کی خوشی اور خوش حالی پر منفی طور پر اثر انداز نہیں ہوتے تو ہمیں ان سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہر طرح کی مکمل آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اس دنیا کی زندگی کے مسائل حل کر سکے اور اپنی مرضی اور خوشی سے جیسے چاہے جی سکے۔ [2] دوسرے لفظوں میں یہ کہ مذہب کو موجودہ دنیوی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں (سیاست، معیشت، معاشرت، قانون، تعلیم وغیرہ) میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے اور نہ اجتماعی زندگی کے ان شعبوں میں مذہبی تعلیمات کا کوئی کردار ہونا چاہیے۔ اپنی انفرادی زندگی میں اگر کوئی فرد اللہ یا آخرت کو مانتا ہے تو اس پر ہمیں اعتراض نہیں۔ [3]

ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر مذہب کی نفی کرتا ہے کیونکہ ہر مذہب اللہ اور آخرت کے تصور پر موجودہ زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔ اس طرح سیکولرزم نے بالواسطہ طور پر نہ صرف روایتی مذہب کی نفی کی ہے بلکہ خود عملاً اس کی جگہ لے لی ہے۔ [4] اس نے مذہب کے دائرہ کار کو محدود

---

[1] G.J.Holyoake, Sixty Years of an Agitatator's Life. vol.2,P-111

[2] محمد عطاء اللہ صدیقی، سیکولرزم کا سرطان در ماہنامہ محدث، لاہور شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص: ۴۴، ۶۶،۵۳ ومابعد

[3] R.Flint. Anti-Theistic Theories, P-211ff

[4] John Summerville. The Secularization of Early Modern England,P-8

کرنے اور اسے غیر مؤثر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

سیکولرزم کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کا اقتدار مطلق اور لامحدود نہیں ہے۔ مغرب کا انسان دنیا کی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی مرضی سے گزارنا چاہتا ہے گویا دنیا کی زندگی میں وہ خود اپنا اللہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ نہ صرف اللہ اور وحی کی برتری کی نفی اور مذہب سے انکار کے مترادف ہے بلکہ یہ انسان کی اپنی خدائی والوہیت کا اعلان بھی ہے۔[1]

یورپ میں جب ہیومنزم کا نظریہ ابھرا تو اس سے یورپی معاشرے میں ارتعاش پیدا ہوا کیونکہ عیسائیت جیسی کیسی بھی تھی، بہرحال صدیوں سے اُن کے معاشرے میں مروج تھی اور اُس کی جڑیں انسانی نفسیات میں گہری تھیں لہٰذا مذہب سے متاثر حلقوں نے ہیومنزم کی مخالفت شروع کر دی۔ ہیومنزم کے حامی مفکرین نے اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کا یہ حل نکالا کہ سیکولرزم کا نظریہ پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کسی شخص کو عیسائی ہونے اور رہنے سے اور انفرادی زندگی میں اسے مذہبی مراسم ادا کرنے سے نہیں روکتے لیکن معاشرے اور ریاست کی اجتماعی زندگی میں مذہب کا کوئی عمل دخل بہرحال نہیں ہونا چاہیے۔

سیکولرزم کا لفظ دینی، مذہبی، روحانی (انگریزی میں Religious, Spiritual Sacred, Transcendental) سے متضاد ہے۔ مطلب یہ کہ فرد کی ذاتی زندگی اور مذہبی امور میں، یعنی وہ امور جو انسان اور خدا کے درمیان تعلق سے بحث کرتے ہیں، ان میں تو خدا اور مذہب کی پیروی کی جا سکتی ہے جیسے اللہ کی عبادت کرنا یا اس سے دعا مانگنا لیکن جو دینوی امور ہیں، یعنی جن کا تعلق انسانوں کے مابین تعلقات سے ہے جیسے انسانوں کی اجتماعی زندگی یا معاشرے و ریاست کے مسائل، تو ان میں خدا یا مذہب کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

---

[1] Encyclopaedia of Religion and Ethics,s.v. Secularisim, vol.11,P-347

سیکولرزم کا خلافِ اسلام ہونا تین دلائل سے واضح ہے:

ایک یہ کہ سیکولر کے معنیٰ 'دنیاوی امور' کے ہیں، برعکس مذہبی، دینی اور روحانی امور کے؛ جب کہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق سرے سے موجود ہی نہیں کیونکہ اسلام نام ہے اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کا جو ہمیں دنیوی زندگی اس کی رضا اور تعلیمات کے مطابق گزارنے کا علم دیتی ہے۔ لہٰذا دنیا کی زندگی کے سارے اعمال عین دینی کام ہیں بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کیے جائیں۔ لہٰذا اسلام میں کوئی عمل ان معنوں میں سیکولر ہوتا ہی نہیں کہ وہ حقیر، بُرا اور قابل مذمت ہو بلکہ اسلام کی رو سے دنیا کا ہر کام دینی کام ہے بشرطیکہ اللہ کی ہدایت کے مطابق کیا جائے۔

دوسرے سیکولرزم کے مغربی تصور کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اختیار انسان کا ہے کہ وہ جہاں چاہے خدا کی بات مانے اور جہاں چاہے نہ مانے۔ گویا زمین میں اصل بادشاہی، اختیار اور حاکمیت انسان کی ہے نہ کہ خدا کی۔ جبکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ وہ انسان کو عبد قرار دیتا ہے یعنی خدا کے مقابلے میں اس کی ہستی ہیچ اور کمترین ہے۔ اور ''اسلام'' کا لغوی اور اصطلاحی مطلب ہی اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اور غیر محدود عبادت اور اطاعت ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ "ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً"[البقرہ ۲: ۲۰۸] اور اس چیز کی مذمت کرتا ہے کہ اللہ کے بعض احکام کو مانا اور بعض کو نہ مانا جائے۔ یہ رویہ اللہ کے نزدیک مردود اور ناقابل قبول ہے اور اسے اپنانے والا مستحق عذاب ہے[الصّف ۶۱: ۲، ۳ اور النساء ۴: ۱۴۵] یہی وجہ ہے کہ اسلام میں دینی و دنیاوی امور کی کوئی تفریق نہیں۔

سیکولرزم کے کے مغربی تصور کے غیر اسلامی ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اسلام میں اللہ کے کسی ایک حکم کا انکار ہدایت کے سارے پیکج کا انکار ہے جیسے ایک نبی کا انکار سارے انبیاء کے انکار کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان سارے انبیائے سابقہ پر ایمان لاتے اور انہیں پیغمبر مانتے ہیں۔ اسی وجہ سے مسلمان قادیانیوں کو مسلمان نہیں مانتے

حالانکہ وہ خدا، رسول، قرآن اور دین کے دیگر سارے احکام کو مانتے ہیں سوائے ختم نبوت کے اور اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا تھا حالانکہ وہ خدا، رسول، آخرت اور قرآن سب کو مانتے تھے، نماز پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا جو ایک حکم الٰہی کا انکار کرتا ہے وہ گویا سارے احکام کا انکار کرتا ہے۔ اس لیے وہ مسلمان نہیں ہے۔

لبرل ازم (Liberalism)

لبرل ازم کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو لامحدود آزادی حاصل ہے۔ ہیومنزم اور سیکولرزم کا لازمی نتیجہ لبرل ازم ہے یعنی جب انسان یہ کہے کہ وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہے بلکہ وہ خود مختار ہے اور جب وہ یہ کہے کہ اس کی مرضی ہے کہ جہاں جس بات میں چاہے وہاں اللہ کی مانے اور جہاں چاہے نہ مانے تو اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ آزاد ہے۔ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ اس رویے کا خلاف اسلام ہونا بالکل واضح ہے کیونکہ ''اسلام'' کا تو لغوی اور اصطلاحی معنی ہی یہ ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے بلا شروط و بلا حدود کلی طور پر اس کے تابع کر دینا اور اللہ کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہوئے خود کو اس کا عبد قرار دینا۔ اسلامی روایت اور اردو محاورے میں لبرلزم کا مطلب ہے مادر پدر آزادی یعنی انسان جو چاہے کرے اُسے کوئی پوچھنے والا نہیں اور وہ کسی کو جواب دہ نہیں۔ چنانچہ ایسی غیر محدود آزادی کی وجہ سے مغرب میں ہر مرد اور عورت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے جب اور جس سے چاہیں جنسی لطف حاصل کریں۔ وہ بغیر نکاح کیے اکھٹے رہ سکتے ہیں، زندگی گزار سکتے ہیں اور بچے پیدا کر سکتے ہیں۔ عورت مرد کو طلاق دے سکتی ہے۔ عورت چاہے تو عورت کے ساتھ اور مرد چاہے تو مرد کے ساتھ اکٹھے رہ سکتا ہے اور نکاح کر سکتا ہے۔

فرد کی لامحدود آزادی کے اثرات مغرب میں زندگی کے ہر شعبے میں دیکھے جا سکتے ہیں مثلاً فرد آزاد ہے کہ وہ چاہے تو کسی مذہب یا دین کو مانے یا نہ مانے۔ اس کی مرضی ہے چاہے تو چرچ جائے نہ چاہے تو نہ جائے۔ چاہے تو لباس پہنے نہ چاہے تو نہ پہنے۔ مغرب میں ننگوں

کے کلب عام بنے ہوئے ہیں جن کا ہر رکن، خواہ مرد ہو یا عورت، جب تک کلب میں رہے لباس نہیں پہنتا۔ بعض عورتیں اور مرد بغیر لباس کے سڑک پر آجاتے ہیں۔ وہ بازاروں میں چلتے پھرتے ایک دوسرے کے گلے لگتے اور بوس وکنار کرتے ہیں اور کوئی کسی کو نہیں ٹوک سکتا۔ ہر مرد وعورت کو شراب پینے، جوا کھیلنے اور باہمی رضامندی سے زنا کرنے کی آزادی ہے۔

یہ آزادی فرد سے اجتماعیت کو منتقل ہوتی ہے اور جس طرح فرد اپنے ہر معاملے میں آزاد ہے اور کسی خدا، رسول، وحی کا پابند نہیں اسی طرح آزاد افراد کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پارلیمنٹ بھی آزاد اور مکمل پاورفل ہوتی ہے اور وہ جو قانون چاہے بنا سکتی ہے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے سکتی ہے۔ چنانچہ عملاً مغربی ممالک نے شراب، جوا، زنا، لواطت اور ہم جنس پرستی کو حلال قرار دے رکھا ہے۔

مغرب میں اس لامحدود آزادی (Unlimited Freedom) کو قانونی تحفظ حاصل ہے چنانچہ مغربی ممالک نے اقوام متحدہ میں بنیادی انسانی حقوق کا ایک چارٹر منظور کر رکھا ہے جس پر ساری دنیا کے ممالک نے دستخط کر رکھے ہیں (بشمول تمام مسلم ممالک کے) جس کی رو سے ہر فرد آزاد ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے اور جب چاہے بدل لے۔ جس مذہب کے فرد سے چاہے شادی کر لے وغیرہ وغیرہ۔ اور چونکہ مغربی فکر وتہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اس تہذیب کو ماننے والے مغربی ممالک ہی دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور ہیں لہٰذا کسی ملک کی 'آزادی' کو اقوام متحدہ اور یہ مغربی ممالک اس وقت تک تسلیم ہی نہیں کرتے اور اسے آزاد ملک قرار ہی نہیں دیتے جب تک اس کے دستور وآئین میں یہ 'بنیادی حقوق' موجود نہ ہوں۔ چنانچہ اقوام متحدہ اور مغربی ممالک (اور ان کے دباؤ میں آکر دنیا کے تمام دوسرے ممالک نے بھی) افغان طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا (سوائے پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے) اس کے باوجود کہ سارے افغانستان پر ان کا قبضہ تھا اور وہ اچھے طریقے سے سارے ملک پر حکومت کر رہے تھے۔

ظاہر ہے لامحدود آزادی کا یہ تصور صریحاً غیر اسلامی ہے کیونکہ اسلام میں تو انسان اللہ کا عبد

ہوتا ہے وہ آزاد ہوتا ہی نہیں اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا ہی عبودیت (ایک اللہ کی پرستش واطاعت) کے لیے کیا ہے[1]۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر انسان مکلف ہوتا ہے یعنی ذمہ دار اور جواب دہ (الّا یہ کہ وہ نابالغ بچہ ہو یا فاتر العقل مریض ہو یا سویا ہوا ہو)[2]۔'اسلام' کا لفظی مطلب تسلیم ورضا اور اطاعت وفرمانبرداری ہے اور 'مسلم' کہتے ہی اس فرد کو ہیں جو'اپنی آزاد مرضی سے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کردے، بلا حدود وبلا شروط' لہٰذا کوئی مسلمان 'مکمل آزاد' ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مومن کی مثال ایک گھوڑے سے دی ہے جو کھونٹے کے ساتھ رسی سے بندھا ہو لہٰذا وہ اتنا ہی آزاد ہوتا ہے جتنی رسی لمبی ہوتی ہے، اس کے بعد اس کی آزادی ختم ہوجاتی ہے۔ اسی لیے مغرب کی آزادی کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎ آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد کیونکہ مومن تو مادر پدر آزاد نہیں ہوتا، ہو ہی نہیں سکتا وہ تو بخوشی ان پابندیوں کو قبول کرتا ہے جو اللہ ورسول نے اس پر لگائی ہیں کیونکہ اسلام میں آخرت کا تصور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور عالم آنے والا ہے جس میں انسان کو دنیا میں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے کہ اس نے دنیا کی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گزاری یا نہیں؟ اسی وجہ سے اقبال نے کہا کہ ؎

محمد کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

خلاصہ یہ کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے کوئی مسلمان مغربی لبرل ازم کے معنوں میں لبرل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست مغربی لبرل ازم کے معنوں میں لبرل ہوسکتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مغربی لبرل ازم خلافِ اسلام ہے، یہ کفر کو مستلزم ہے بلکہ صریح کفر ہے اور کوئی مسلمان جب تک وہ مسلمان ہونے کا مدعی ہے، لبرل نہیں ہوسکتا۔

---

[1] الذاریات ۵۱:۵۶

[2] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۰۴۱

یہ بھی واضح رہے کہ 'ہم لبرل ازم' کے اپنے پاس سے کوئی معنی وضع نہیں کر سکتے کیونکہ لبرل ازم مغرب کی اصطلاح ہے اور اس کے معنی ومفہوم وہی بتائیں گے جن کی یہ اصطلاح ہے نہ کہ ہم اپنی مرضی سے اس کے معنی ومفہوم کا تعین کر لیں۔

میٹریلزم (Materialism)

مادہ پرستی کی اصطلاح اُردو میں بھی عام مستعمل ہے اور اس کا مفہوم مذہبی واخلاقی تعلیمات (جو آخرت اور اعلیٰ انسانی اقدار پر زور دیتی ہیں) کے مقابلے میں یا ان کے علی الرغم دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھنا اور اسے ترجیح دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ علمی اردو لغت میں مادہ پرست کے معنی لکھے ہیں "مادے کو سب کچھ سمجھنے والا، دہریہ، خدا کا منکر"[1] مادہ پرستی کا نظریہ شروع ہی سے مذہبی نقطۂ نظر کے برعکس اور بالمقابل سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ یونانیوں کے ہاں مادہ پرستی کے مفاہیم میں یہ عناصر شامل تھے:

۱۔ مادہ ازلی اور غیر فانی ہے۔

۲۔ عالم میں کوئی ذہن یا شعور کارفرما نہیں ہے یعنی اس پر کوئی یزدانی قوت متصرف نہیں ہے۔

۳۔ عالم میں کوئی مقصد اور غایت نہیں ہے۔

مغرب میں تحریک نشأۃ ثانیہ کی ابتداء میں چونکہ پاپائیت نے فکری آزادی کی مخالفت کی لہٰذا سائنسدانوں کو مذہب کو ردّ کرنا پڑا اور مادہ پرستی کی طرف آنا پڑا۔ تھامس ہوبز (۱۶۷۹ء) نے مکمل مادیت کا ابلاغ کیا۔ اس کی رائے میں انسان سمیت کائنات کی ہر شے مادی ہے۔ وہ حسیات کے سوا کسی چیز کو علم کا ماخذ تسلیم نہیں کرتا، اس نے روح کے وجود سے انکار کیا اور مذہب کو غیر مرئی فرضی قوتوں کی دہشت قرار دیا۔ وہ قدر واختیار کا بھی منکر تھا۔[2]

---

[1] وارث سرہندی، علمی اردو لغت، بذیل "مادہ پرست"، ص: ۱۳۲۲

[2] L. Zusne, Names in the History of Psychology, P-23

تاہم جدید مادیت پسندی کا بانی ڈیکارٹ (۱۶۵۰ء) کو سمجھا جاتا ہے جو ذہن اور مادے کو مستقل بالذات مانتا ہے۔اس کے نزدیک حیوانات کا جسم ایک خودکار مشین کی مانند ہے اور جسمانی لحاظ سے انسان بھی حیوان ہی کی طرح کی ایک مشین ہے۔

اٹھارویں صدی میں سائنس کی ہمہ گیر ترقی نے عقلیت پسندی کو جنم دیا۔فرانسیسی مادہ پرست قاموسیوں (Encyclopaedians) نے وحی کے بغیر ہیومنزم کی بنیاد پر ایک مذہب مرتب کرنے کی کوشش کی۔ لامتری نے انسانی قلب وذہن کے تمام اعمال کو میکانکی قرار دیتے ہوئے اسے دیگر حیوانوں کی طرح ایک حیوان قرار دیا۔ ہولباخ نے اس مادی نظریے کو ایک باقاعدہ مابعد الطبیعیات کی شکل دی۔اس نے روح کے وجود سے انکار کیا اور مادے کو غیر فانی قرار دیا۔اس نے کہا کہ فطرت چند اٹل قوانین کے تحت کام کر رہی ہے جن میں کوئی مقصدیت پنہاں نہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اٹھارویں صدی کے مادی نقطۂ نظر کا خلاصہ تین نکات کی صورت میں پیش کیا ہے:[1]

۱۔حقائق مشاہدے پر مبنی ہونے چاہئیں نہ کہ ایسی سند پر جو عقیدے کے تحکم پر مبنی ہو۔

۲۔ مادی دنیا ایک ایسا نظام ہے جو خودکار ہے اور جس میں تمام تغیرات طبعی قوانین کے تحت ہوتے ہیں۔

۳۔ کرۂ ارض کائنات کا مرکز نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی مقصد و معنی ہے۔

انیسویں صدی میں ہیگل اور ڈارون نے مادی نقطۂ نگاہ کو مزید آگے بڑھایا۔ہیگل نے کہا نیچر وہ ہے جس کا ادراک ہم حواس خمسہ سے کرتے ہیں نیز اس نے شعور و ذہن کی تشریح عضویاتی پہلو سے کی۔ڈارون نے حیاتیات کے مطالعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان حیوان ہی سے ارتقاء پذیر ہوا ہے۔سپنسر نے کہا کہ انسان سمیت سب ذی حیات پر طبعی قوانین کا اطلاق ہونا چاہیے۔

---

[1] B. Russell, History of Western Philosophy, P-387

بیسویں صدی میں اگر چہ مادہ بحیثیت ایک شے کے غائب ہو گیا جب شراڈنگر، پلانک اور ہائزن برگ نے نظریۂ مقادیر عنصری پیش کرتے ہوئے یہ کہا کہ مادہ اور توانائی ایک دوسرے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آئن سٹائن کی تحقیقات اور نظریۂ اضافت نے ثابت کر دیا کہ مادہ ٹھوس نہیں ہے۔ اس طرح زمان ومکان کے قدیم تصورات تحلیل ہو گئے لیکن بایں ہمہ مادہ پرستی کی روح (جس کا خلاصہ خدا کی خدائی کی نفی اور اس کی جگہ فطرت کو فعال ماننا، وحی کی برتری کا بطلان اور حسی علم کو اس کی جگہ دینا، حیوانات کے قوانین کا اطلاق انسان پر کرنا اور آخرت کے مقابلے میں دنیا اور مظاہر دنیا کو ترجیح دینا وغیرہ) مغرب کے فکر وعمل میں ہر سو جاری ہے۔

ظاہر ہے مغربی فکر وتہذیب کی یہ مادہ پرستی خلاف اسلام ہے۔ اسلام انسان کے مادی وجود اور اس کی احتیاجات اور مقتضیات کی نفی نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی اسے ایک اخلاقی وجود قرار دیتا ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں مثلاً قرآن حکیم نے صرف سال میں ایک ماہ کے روزے فرض کیے[1] اور مریض ومسافر کو استثنیٰ دیا[2]۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو مسلسل روزے رکھنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا[3] اور فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے[4]۔ چنانچہ اسلام نفس کشی کی اجازت نہیں دیتا بلکہ تہذیب نفس کا قائل ہے اسی لیے بعض صحابہ نے خصی ہونے کی اجازت مانگی[5] تو آپ ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ بھی مشہور ہے جس میں انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے عبادت کے معمولات پوچھے تو انہوں نے انہیں کم

---

[1] البقرہ ۲: ۱۸۳

[2] البقرہ ۲: ۱۸۴

[3] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۵۰۶۳

[4] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۱۹۶۸

[5] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۵۰۷۱

سمجھا کہ آپ تو معصوم عن الخطا تھے اور پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ ساری رات عبادت کیا کرے گا۔ دوسرے نے کہا کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھا کرے گا اور تیسرے نے کہا کہ وہ شادی نہیں کرے گا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ باتیں سنیں اور آپ (ﷺ) کے گھر لوٹنے پر انہیں بتائیں تو آپ ﷺ کو یہ پسند نہ آئیں اور آپ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور ان تینوں اصحاب کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ مَیں اللہ کا پیغمبر ہوں اور روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں۔ رات کو سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں اور مَیں نے شادیاں بھی کر رکھی ہیں[1]۔ خلاصہ یہ کہ اسلام ایک توازن کے ساتھ انسان کے مادی اور اخلاقی وجود دونوں کے مطالبات پورے کرتا ہے۔

کیپٹل ازم (Capitalism)

کیپٹل ازم یعنی مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کی تین سطحیں یا حیثیتیں ہیں: ایک تو یہ کہ وہ ایک معاشی نظام ہے۔ معاشی نظام ہونے کی حیثیت میں بھی وہ غیر اسلامی ہے اور غیر عقلی و غیر فطری ہے یعنی خلافِ فطرت انسانی ہے۔ کیپٹل ازم کو غیر اسلامی اور غیر فطری و غیر عقلی ثابت کرنا خود ایک بڑا علمی موضوع اور تحقیقی پراجیکٹ ہے۔ اس پر کافی کام ہو چکا لیکن ابھی اس پر مزید علمی کام کی ضرورت ہے.... بلکہ یہی کام ساری مغربی آئیڈیالوجی، افکار و نظریات، ورلڈ ویو اور اداروں (جیسے نیشن سٹیٹ، ڈیموکریسی وغیرہ) کے بارے میں کیا جانا چاہیے؛ تاہم ظاہر ہے یہاں محض اس کام کی نشان دہی ہی کی جا سکتی ہے۔

کیپٹل ازم کی بطور ایک معاشی نظام تین اہم خصوصیات ہیں: ایک یہ کہ وہ انسان اور محنت کے مقابلے میں سرمائے کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی بناء پر وہ سود (ربا) کو جائز ٹھہراتا اور استعمال کرتا ہے اور تیسرے یہ کہ وہ مادر پدر آزادی چاہتا ہے یہاں تک کہ وہ ریاست کی ریگولیٹری/ مانیٹرنگ اتھارٹی کو بھی تسلیم نہیں کرتا اور فری مارکیٹ

[1] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۵۰۶۳

اکانومی کا تصور دیتا ہے۔معیشت کے یہ تینوں بنیادی اصول اسلام کی اقتصادی تعلیمات اور معاشی نظام کے خلاف بلکہ ان سے متضاد ہیں کیونکہ اسلام مغرب کی سرمایہ پر مبنی اور اشتراکیت کی محنت پر مبنی انتہا پسندی کے خلاف انسان اور اس کی متوازن اور مبنی بر عدل اجتماعی فلاح کا علمبردار ہے اور اس پر ترکیز کرتے ہوئے سرمائے اور محنت کے متوازن کردار کو اپناتا ہے۔اسی طرح اسلام سود کی شدید مخالفت کرتا ہے بلکہ اسے اللہ ورسول کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیتا ہے۔[1] اور یہ وہ واحد حکم ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایسے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ربا کا لازمی نتیجہ ارتکاز دولت ہے اور اس کے نتیجے میں امیر امیر تر اور غریب،غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے جس کا مشاہدہ ہم آج اپنی آنکھوں سے کررہے ہیں کہ اس سرمایہ دارانہ سودی نظام کی وجہ سے امریکہ ویورپ میں دولت کا ارتکاز ہوگیا ہے اور ایشیا وافریقہ کے اکثر ممالک،خصوصاً عالم اسلام،بھوک اور ننگ کا شکار ہے،جبکہ اسلام تقسیم دولت کی تعلیم دیتا ہے[2] تاکہ معاشرے میں اقتصادی توازن برقرار رہے۔

اسی طرح اسلام سرمایہ کے کردار پر ریاست وحکومت کی نگرانی کا اصول تسلیم کرتا ہے کیونکہ اگر اسلامی ریاست سرمائے کے کردار کو کنٹرول نہ کرے تو سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ منافع کے لالچ میں حرص وہوس اور استحصال کی ہر حد کو پار کرلیتا ہے۔

نظام سرمایہ داری کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ محض معاشی نظام نہیں بلکہ دین ومذہب واخلاق کے مقابلے میں مادہ پرستی (میٹریل ازم) پر مبنی مکمل دین اور نظامِ حیات ہے۔یہ دنیا،دولت اور معاشی ترقی (یعنی دنیا میں زیادہ سے زیادہ آسائشوں اور راحتوں کو یقینی بنانا) کو بنیاد بناتا ہے اور اخروی زندگی اور اس کی کامیابی اور دنیا پر اس کی ترجیح کے اسلامی اصول کو ردّ کرتا ہے۔یہ انسان کو "عبدالدرھم والدینار" بنا دیتا ہے اور اسے حرص

---

[1] البقرہ ۲:۲۷۹
[2] الحشر ۵۹:۷

وہوس وحسد کے جال میں جکڑ لیتا ہے جس کی مذمت ہادی برحق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے علی الاعلان فرمائی ہے۔[1] اور آخرت کی ترجیح والی زندگی عملاً گزار کر دکھائی ہے کہ وہ کتنی سادہ، توکل ،قناعت اور زہد پر مبنی ہوتی ہے جس کا ہدف آخرت کی کامیابی اور اللہ کی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے نہ کہ محض دنیا کی ترقی اور اس میں آسائشوں اور راحتوں کا حصول، راتوں رات امیر بننے کی خواہش، حلال وحرام کی عدم تمیز، معیار زندگی بلند کرنے کی دوڑ (یعنی ہر قیمت پر کار، کوٹھی اور بنک بیلنس کا حصول)، کرپشن، رشوت، چوری، ڈاکے، فراڈ اور بددیانتی.... مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے غلبے کے مظاہر ہیں۔

کیپٹل ازم کے جس کردار کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے اس کے بعد ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مغرب کا نظام سرمایہ داری نہ صرف خلاف اسلام ہے اور اس کی تعلیمات اور اصولوں سے متضاد ہے بلکہ وہ دین اللہ کے مقابلے میں طاغوت اور اسلامی طرز زندگی کے مقابلے میں کفر وجاہلیت پر مبنی نظام حیات ہے کہ مسلمان مادہ پرست (Materialist) ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر مغرب کا نظام سرمایہ داری کفر ہی نہیں کفر گر بھی ہے۔ (جیسے بادشاہ کے مقابلے میں بادشاہ گر) اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کفر اس کے بعد وجود میں آنے والے مغربی افکار ونظریات اور اداروں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ جمہوریت بظاہر ایک سیاسی نظام ہے لیکن یہ صرف جمہوریت نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے یعنی جمہوریت کے سیاسی نظام میں سرمایہ دارانہ روح غالب اور فعال ہے۔ جمہوری انتخابات میں وہی فرد اور جماعت جیت سکتی ہے جو زیادہ سے زیادہ سرمایہ خرچ کرسکتی ہو چنانچہ پارلیمنٹ ہو یا اس کے ذریعے بننے والی حکومت، اس میں سرمایہ دار ہی غالب ہوتے ہیں اسی طرح مغرب کا ایک معاشرتی نظام ہے لیکن یہ بھی 'سرمایہ دارانہ معاشرتی نظام' ہے کیونکہ اس معاشرے کے خدوخال سرمایہ ہی طے کرتا ہے (مردوں کے علاوہ عورتیں بھی کام کریں، بچے ڈے کیئر سنٹرز میں پلیں، مائیں بچوں کو دودھ نہ پلائیں، والدین اور بچوں میں رابطہ اور محبت

---

[1] جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۷۵

کی کمی، بچہ بالغ ہونے پر والدین کی ذمہ داری نہیں۔ بوڑھے اولڈ ایج ہومز میں جائیں، اولاد کا والدین کی خدمت کرنے کا عدم تصور۔ حرامی بچوں اور طلاقوں کی کثرت....وغیرہ) غرض پوری معاشرتی زندگی پر نظام سرمایہ داری کی گہری چھاپ ہے۔ غرض یہ سمجھنے میں دقت پیش نہیں آنی چاہیے کہ کیپٹل ازم محض ایک معاشی نظام نہیں بلکہ کفر پر مبنی نظامِ حیات ہے۔

تجربیت (Empiricism)

مغرب کا تصور علم یا فلسفۂ علم (Epistemology) یہ ہے کہ علم کا منبع عقل اور تجربہ و مشاہدہ ہے۔ ظاہر ہے جب ہیومنزم کی رو سے خدا کا انکار لازمی ٹھہرا اور اُس کے مقابلے میں انسان کی خدائی کا ڈنکا بجایا گیا تو اب علم کا منبع بھی انسان اور اُس کی عقل ہی ٹھہری اور عقل بھی وہ جسے تجربہ اور مشاہدہ کا تڑکا لگایا گیا ہو۔ اب چونکہ نہ خدا نظر آتا ہے، نہ فرشتے اور نہ آخرت لہٰذا نہ صرف اُن کا وجود مشکوک ٹھہرا بلکہ خدا کی طرف سے ملنے والی ہدایت بھی ناقابل توجہ ٹھہری۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب مذہبی علم اور عقائد کو ڈاگما (Dogma) یعنی الٰہی تحکم پر مبنی آراء اور توہمات سمجھ کر ردّ کر دیتے ہیں اور حقیقی و حتمی علم کا منبع انسانی عقل اور تجربہ و مشاہدہ کو قرار دیتے ہیں جن سے حاصل ہونے والا علم قابل تصدیق (Verifiable) ہوتا ہے۔

گویا تجربیت سے مراد ہے وحی اور عقل سے حاصل ہونے والے علم کے مقابلے میں حسیات سے حاصل ہونے والے علم کو یقینی اور قابل عمل ماننا۔ یہ تقابل شروع ہی سے فکر انسانی میں موجود رہا ہے۔ وحی کی برتری کو ماننے والے اہل مذاہب ہیں، عقل کو منبع علم سمجھنے والے اکثر فلسفی ہیں جب کہ سائنس دان (اور سائنسی منہج پر مبنی دیگر علوم کے ماہرین) حسّی علم کو حتمی اور یقینی سمجھتے ہیں۔ یونان قدیم کے سوفسطائی حسیات کو علم انسانی کا ماخذ سمجھتے تھے جب کہ افلاطون اور اس کے ہم خیال یہ سمجھتے تھے کہ عقل بذاتِ خود، حسّی تجربے اور مشاہدے کی تصدیق کے بغیر، صداقت کے انکشاف پر قادر ہے۔ رومیوں اور قرون مظلمہ سے گزر کر جب یہ علمی روایت احیائے علوم اور نشأۃ ثانیہ کے دور میں داخل ہوئی تو کائنات کی

حقیقت سے متعلق دو نظریے وجود میں آئے: ایک وہ جو افلاطون اور ارسطو کی روایت کی یادگار تھا اور جس کی رو سے امثال حقیقی ہیں اور دوسرا وہ جس کی رو سے کائنات کی حقیقی اشیاء خاص وہ اشیاء ہیں جو ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں۔ پہلی روایت سے (عیسائی) مذہب نے اپنی تصدیق کا کام لیا اور دوسری روایت نے جدید سائنس کی بنیادیں استوار کیں۔ سائنس میں گلیلیو اور فلسفے میں فرانسس بیکن ان رجحانات کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

بیکن کے نزدیک علم کا ماخذ حِسیات ہیں اور علم صرف انسانی تجربے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس نے فلسفے کو مذہب سے جدا کر کے علم کلام کو بے مصرف اور بے ثمر رجحان قرار دیا۔ تھامس ہوبز نے بھی حسیات ہی کو علم کا ماخذ قرار دیا اور سائنس اور فلسفے کو مذہب (علم کلام) سے نجات دلانے کی دعوت دی۔ نیوٹن کی طرح جان لاک بھی تجربے اور مشاہدے سے علمی نتائج اخذ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ازلی و ابدی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں ہے اور حس ہی ہمارے علم کا ماخذ ہے۔ اس نے ضمیر کے وجود کا بھی انکار کیا اور کہا کہ اخلاقی قوانین جبلی نہیں ہوتے بلکہ حسیات کے واسطے سے حاصل کیے ہوئے علم کی روشنی میں ہم جو رائے (صحیح یا غلط) قائم کرتے ہیں وہی ضمیر ہے۔ سیاست میں وہ عوام کی حاکمیت کے نظریے کے علمبردار تھا۔[1] ہیوم نے جو اٹھاویں صدی کی تشکیک کا امام تھا، لاک کے فلسفۂ تجربیت کو منطقی انجام تک پہنچا دیا۔ اس نے کہا کہ انسانی تجربہ ہی انسانی علم کا ماخذ ہے اور صرف انہی اشیاء کا وجود ہے جن کا ادراک کیا جاسکے۔ اس بناء پر اس نے نفس انسانی، روح اور خدا کا انکار کر دیا کیونکہ یہ تصورات قابل ادراک نہیں ہیں۔[2] انیسویں صدی میں

[1] John Locke, An Essay Concerning Human Understanding, P-275ff

[2] David, Hume, An Enquiry Concering th Principlco of Morals, P-289

کومتے، بنتھم اور ولیم جیمز نے ہیوم کے اثرات قبول کیے۔

کومتے کو ایجابیت (Positivism) کا بانی کہا جاتا ہے جو تجربیت ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کے نزدیک کائنات اور کائنات میں انسان کے مقام کا تعین انسانی مشاہدے اور تجربے ہی کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ اس اساس پر وہ انسان کو مرکز کائنات سمجھتا ہے کیونکہ خدا پر ایمان لانا اور کسی وجود مطلق کو ماننا انسانی تجربے سے متجاوز ہے لہٰذا اس کے نزدیک ایک ہی وجود مطلق ہے اور وہ ہے انسانیت عالیہ لہٰذا صرف انسان کی فلاح و بہبود کی کوشش ہی نیکی ہے۔ اسی طرح کومتے کے نزدیک انسانی ذہن تین مراحل سے گزرا ہے مذہب، مابعد الطبیعیات اور مرحلۂ موجودہ یعنی ایجابیت یا سائنس۔ اس کے نزدیک مذہب اور مابعد الطبیعیات فصۂ پارینہ بن چکے ہیں اور اب سائنس کی خدائی کا دور ہے۔[1]

امریکہ کے نتائجیت پسند فلاسفہ ولیم جیمز اور ڈیوی اور دوسرے دور کے تجربیت پسندوں میں سے جان اسٹوارٹ مل اور بنتھم کومتے کے افکار سے متاثر ہیں۔ اسی طرح درخائیم، لیوی بروہل، تین اور رینان نے کومتے کے عمرانی نظریات کو بیسویں صدی میں نیا آہنگ دیا ہے۔

جان سٹوارٹ مل بھی جرمی بنتھم کی طرح افادیت (Utilitarianism) کا قائل ہے اور اس کی طرح زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ مسرت بہم پہنچانے کو اخلاقیات کا نصب العین قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ صرف لذت کی خواہش کی جاتی ہے اس لیے لذت ہی مستحسن ہے جب کہ بنتھم تو یہاں تک کہتا ہے کہ لذت ہی خیر ہے اور اذیت ہی شر ہے اور افادیت ہی ہر شے کا معیار ہے۔

امریکی نتائجیت پسندی (Pragmatism) کا شارح ولیم جیمز ہے جو لاک، ہیوم، کانٹ، پیرز اور کومتے کے افکار کا جامع تھا۔ ولیم جیمز کسی صداقت مطلقہ کا قائل نہیں تھا اور

[1] E.A. Esper, A History of Psychology, P-212

وجود مطلق (اللہ تعالیٰ) کو "مابعد الطبیعی عفریت" کا نام دیتا تھا۔ اس کے خیال میں صرف وہی اشیاء موضوع بحث بن سکتی ہیں جو انسانی تجربے سے لی گئی ہوں۔ انسانی تجربہ ہی حقیقت ہے اور صرف انسانی مشاہدہ اور تجربہ ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ اس کے نزدیک نتائجیت پسندی ایک طرزِ فکر ہے جس کا مقصد کسی نوع کی ازلی صداقتوں کا کھوج لگانا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس بات سے انسانی تجربے یا طرز عمل میں کچھ فرق نہیں پڑتا کہ آیا وجود مطلق ہے یا نہیں؟ جیمز کی افادیت اور نتائجیت پسندی کا یہ عالم ہے کہ وہ مذہب کو بھی نتائج کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان کا جوہر نہ جذبہ ہے نہ عقل بلکہ ایمان لانے کا ارادہ ہے جسے سائنسی طریقوں سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مذہب میں کسی صداقت مطلقہ کا کھوج نہیں لگایا جاسکتا البتہ یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ اللہ، حیات بعد الموت اور قدر و اختیار پر عقیدہ رکھنے سے ہمیں کوئی عملی (دنیاوی) فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو ان عقائد کے اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔[1]

نتائجیت پسندی کا ایک اور مشہور شارح جان ڈیوی ہے جو جیمز ہی کی طرح فکر انسانی کو محض ایک آلہ سمجھتا ہے اس کے نزدیک کسی نظریے کی عملی کامیابی کی طرف رہنمائی ہی اس کی صداقت کا واحد معیار ہے۔ انگلستان کے پروفیسر شار نے نتائجیت پسندی کو انسان پسندی سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک جو کچھ بھی انسان کے لیے صحیح ہے اسے کسی مافوق الفطرت ہستی کی بجائے انسانی مفاد ہی کی پرورش کرنی چاہیے۔ گویا خدا کو بھی صرف اس لیے مانو کہ اس سے دنیوی فائدہ ہوتا ہے ظاہر ہے اس سے بڑھ کر سیکولرزم اور لادینیت کا تصور کیا ہوسکتا ہے کہ عملی کامیابی، نتیجہ خیزی اور افادیت کو افکار کی صداقت کا معیار قرار دیا جائے بلکہ یہ تو محض کاروباری ذہنیت کی عکاسی ہے۔

تجربیت اور اس کی بعض ذیلی شاخوں کے اس مختصر بیان سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ

---

[1] L. Zusne, Names in the History of Psychology, P-98

تجربیت نے نہ صرف مذہب اور وحی کی برتری کو رد کیا بلکہ ادراک حقائق کا انحصار محض انسانی مشاہدے اور حسی تجربے کو قرار دے کر اسے ایک متبادل مذہب اور نظریۂ حیات بنا کر پیش کیا۔ اس نقطۂ نظر کو دوسرے علوم و فنون پر بھی غالب کر دیا اور انہیں لادینی بلکہ دین دشمنی کے رنگ میں رنگ دیا۔

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہے کہ مغربی فکر و تہذیب میں حسّی علم اور تجربے سے حاصل ہونے والا علم ہی یقینی اور حتمی ہوتا ہے اور خدا، وحی، فرشتے اور آخرت کا تصور چونکہ اس معیار پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا وہ قابل ردّ ہیں اور مغربی فلسفۂ علم کی رو سے وہ علم کے معیار پر پورے نہیں اُترتے لہٰذا وہ توہمات (Superstitions) ہیں یا آسمانی تحکم پر مبنی Dogma ہیں، وہ علم بہر حال نہیں ہو سکتے کیونکہ حسّی اور تجربی علم کی رو سے وہ قابل تصدیق (Verifiable) نہیں ہیں۔ مغرب کا یہ نظریہ ممکن ہے سائنس میں ترقی کا ذریعہ اور سبب بنا ہو لیکن اس نے مذہب کو بہر حال دیس نکالا دے دیا ہے اور مغربی فکر و تہذیب کے ماننے والے اہلِ دانش، فلسفیوں اور سائنس دانوں کے ہاں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

مغربی تہذیب کا ورلڈ ویو (World View)

مغربی فکر و تہذیب کے بنیادی نظریات کے مطالعہ کے بعد اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ یہ جان سکیں کہ ان نظریات پر مبنی فکر سے کیسا ورلڈ ویو وجود میں آتا ہے۔ ورلڈ ویو مغرب کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس فکر و تہذیب کی رو سے اہل مغرب کا تصورِ الٰہ، تصورِ انسان، تصورِ کائنات، اور تصورِ علم کیا ہے؟

تصورِ الٰہ

جیسا کہ ہم نے ہیومنزم کے بارے میں دیکھا کہ نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے اور بعد میں تحریک تنویر نے اُس وقت کے مذہب (عیسائیت) کو رد کر دیا کیونکہ وہ مذہب بادشاہت اور جاگیرداروں کے ساتھ مل کر عوام کا استحصال کر رہا تھا۔ نیز حضرت عیسیٰؑ کی اصل تعلیمات

میں انحرافات اور یونان کے وقتی سائنسی نظریات کے اُس میں ادخال کے سبب جدید سائنسی اکتشافات کے خلاف ثابت ہو رہا تھا۔ لہٰذا ان دو وجوہ کی بنا پر اُبھرتی ہوئی مغربی تہذیب کے قائدین نے ، اصلاً عیسائی ہونے کے باوجود ، مذہب کو ردّ کر دیا اور عیسائیت کونوں کھدروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئی۔ جب مذہب ردّ ہو گیا تو تصورِ الٰہ یا تصورِ خدا جو مذہب کی جان ہے، منطقی طور پر وہ بھی ردّ ہو گیا۔ اور اگر ہم یہ پیش نظر رکھیں کہ عیسائیت کا تصورِ الٰہ یعنی تثلیث ویسے بھی غیر فطری، غیر سائنسی ، غیر عقلی اور مذہب کی حقیقی تعلیمات کے خلاف تھا، لہٰذا جدید مغربی تہذیب کا اُس کو ردّ کرنا قابل فہم محسوس ہوتا ہے۔

مغرب کے اس تصورِ خدا کا ملحدانہ اور کافرانہ ہونا اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے دلائل دینے کی بھی ضرورت نہیں اور ایک عام مسلمان بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ہیومنزم کفر صریح ہے اور ایک مسلمان ہرگز اس کو نہیں مان سکتا ، خواہ اس کو ''انسانیت'' کا خوبصورت لبادہ پہنانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے!

تصورِ انسان

جیسا کہ ہم نے سطورِ بالا میں دیکھا ہے کہ مغربی تہذیب کا تصورِ انسان جس کی ابتداء تحریک نشاۃ ثانیہ میں انسان کی تکریم اور اُسے کائنات میں مرکزی حیثیت دینے سے ہوئی تھی ، اُس نے بالآخر مغربی تہذیب میں آسمانی خدا کے انکار اور خود انسان کے اپنا خدا خود ہونے کے تصور کو مستحکم کر دیا جیسا کہ ہم نے سارتر ، ولیم جیمز اور نطشے وغیرہ کے اقوال میں دیکھا ہے۔ یوں مغربی تہذیب خدا مرکز (God-Centric) ہونے کی بجائے انسان مرکز (Human-Centric) بن گئی۔

ظاہر ہے یہ تصورِ انسان اسلام کے تصورِ انسان کے بالکل برعکس ہے کیونکہ اسلام میں انسان اللہ کا عبد ہے[1] اور اس کا کام ہر حالت میں اور انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں

---

[1] ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات۵۱:۵۶]

بلا شروط وحدود اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کرنا ہے۔

تصورِ کائنات

جب خدا کا تصور نہ رہا اور نہ رسولوں کا تو پھر آخرت کا تصور کہاں سے آتا؟ چونکہ میٹریل ازم یا مادہ پرستی میں یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی صرف اس دنیا کی مادی زندگی ہے اور آخرت کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح کیپٹل ازم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور یہی ہمارا ہدف اور مقصود ہے اور اس میں دولت اور آسائشوں اور راحتوں کا حصول ہی انسان کا مقصد زندگی ہے خواہ وہ جس قیمت پر بھی ہو۔

مغربی تہذیب آخرت کا انکار اس لحاظ سے بھی کرتی ہے کہ عقل اور حسی علوم کی بنیاد پر آخرت کا اثبات نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ظاہر ہے کہ آخرت نہ نظر آتی ہے اور نہ اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام آخرت پر مبنی دین ہے اور اس میں آخرت کو دنیا کی زندگی پر ہر حالت میں ترجیح حاصل ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے آخرت پر دنیا تو قربان کی جا سکتی ہے لیکن آخرت کو دنیا کے لیے برباد نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''[۱] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دنیا کی اہمیت اللہ کی نظر میں ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ کافروں کو نہ دیتا۔[۲]

تصورِ علم

جیسا کہ ہم نے ایمپیریسزم میں دیکھا کہ علم کا منبع یا تو عقل ہے یا حسی علم یعنی تجربہ اور مشاہدہ۔ اس کو مغربی دانشور یوں بھی کہتے ہیں کہ حتمی اور یقینی علم وہ ہے جو قابل تصدیق

---

[۱] اسے مستدرک حاکم اور مسند الفردوس میں حدیث کہا گیا ہے اگرچہ اکثر محدثین نے اسے ضعیف اور موضوع قرار دیا ہے۔

[۲] جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۲۰

(Verifiable) ہو۔ اس کا صاف مطلب ہے وحی اور منزل من اللہ ہدایت کی نفی اور رسولوں کی تعلیمات کا انکار۔

ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب کا یہ تصورِ علم اسلام کے تصورِ علم کے سو فیصد خلاف ہے کیونکہ اسلام میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا وہ حق ہے اور حرفِ آخر ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ ﴿الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الملک ٦٧:٢٦] اور ﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ [البقرہ ٢:١٢٠]

''کہہ دو کہ خدا کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے۔ اور (اے پیغمبر) اگر تم اپنے پاس علم (یعنی وحی خدا) کے آجانے پر بھی ان کی خواہشوں پر چلو گے تو تم کو (عذاب) خدا سے (بچانے والا) نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔''

اسی طرح اللہ کا رسول اور نمائندہ ہونے کی حیثیت سے پیغمبر جو بات کہے وہ بھی حق ہے اور حتمی طور پر سچی ہوتی ہے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ [النجم ٥٣:٣،٤]

''اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔''

اور یہ کہ ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ [الحشر ٥٩:٧]

''سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو۔ اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔''

بلاشبہ اسلام میں عقل کا کردار بھی ہے جسے اجتہاد کی صورت میں دین نے ہمیشہ کے لیے شریعت میں اہم جگہ دی ہے لیکن یہ کردار ضمنی ، جزوی اور نصوص کے ماتحت (Subordinate) ہے نہ کہ ان پر حاوی یا ان کے مساوی۔

اس وقت تک ہم نے مغربی تہذیب کے بنیادی افکار پیش کرنے کے بعد ان پر جو تبصرہ کیا ہے اُس سے واضح ہے کہ مغربی تہذیب کے اساسی افکار خلافِ اسلام ہیں۔ اسی طرح مغرب کا ورلڈ ویو اسلامی ورلڈ ویو کے بالکل برعکس ہے۔ یہ بات اگرچہ سطورِ سابقہ سے واضح ہے لیکن ہم اسے مزید واضح کرنے کی خاطر ایک جدول کی صورت میں پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ ایک نظر میں قارئین کے سامنے آجائے اور مزید واضح ہو جائے:

مغربی تہذیب کے بنیادی نظریات	اسلام کے بنیادی نظریات
۱۔ ہیومنزم: خدا کا انکار، انسان کا خودمختار اور قادرِ مطلق ہونا۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا الْاِنْسَانَ کا شعار	خدا ہی اس کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ انسان اس کا عبد ہے۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا شعار
۲۔ سیکولرزم: خدا اور مذہب کو انسان کے اجتماعی معاملات (معاشرہ اور ریاست) میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ ہاں اگر فرد چاہے تو اپنی ذاتی اور پرائیویٹ زندگی میں خدا کو مان سکتا ہے۔	عبد کے لیے ضروری ہے کہ پورے کا پورا دین میں داخل ہو جائے۔ اسے اجازت نہیں کہ وہ اپنی مرضی چلائے اور رب کی کچھ باتوں کو مانے اور کچھ کو ماننے سے انکار کر دے۔
۳۔ لبرل ازم: انسان چونکہ خودمختار ہے بلکہ مختارِ مطلق ہے لہٰذا اسے حق ہے کہ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ وہ مادر پدر آزاد ہے۔ کوئی اس کی آزادی کو محدود نہیں کر سکتا۔	انسان خودمختار نہیں اللہ کا عبد ہے لہٰذا اللہ کے مقابلے میں وہ اپنی مرضی نہیں چلا سکتا۔ وہ مادر پدر آزاد نہیں بلکہ اس کی لگام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ جتنی آزادی اسے دیتا ہے وہ لمبی رسی سے بندھے گھوڑے کی طرح اتنا ہی آزاد ہے۔ جہاں اس کی لمبائی ختم ہوئی اس کی آزادی بھی ختم ہو گئی۔

کیپٹل ازم/میٹریل ازم انسان مادہ پرست ہے، وہ دنیا پرست اور مال پرست ہے۔ دنیا کی زندگی ہی اس کے لیے سب کچھ ہے یہاں کی عیش، سہولتوں اور آسائشوں کا حصول ہی انسان کا آخری ہدف ہے۔ آخرت کس نے دیکھی ہے؟ لہٰذا راتوں رات امیر بننا چاہئے، مال کمانے اور خرچ کرنے میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں۔ زیادہ سے زیادہ کمانے، دنیا میں آگے بڑھنے معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہر آدمی میں ہونا چاہیے۔	اسلام ایک آخرت مرکز (Akhirat Oriented) دین ہے جس میں عبادت اور اخلاقی بلندی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ دارالامتحان ہے۔ یہاں کامیابی اس امر میں ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ تعالی کے احکام کے مطابق گزاری جائے اور اس کے نتیجے میں اخروی زندگی میں اللہ کی رضا اور جنت کی توقع رکھی جائے۔ اسلام میں غناء، مال ودولت کی کثرت میں نہیں توکل اور قناعت میں ہے۔
۵۔ ایمپریسزم مغربی تہذیب کا فلسفہ علم یہ ہے کہ حق کا منبع عقل اور حسی علم (انسانی تجربہ و مشاہدہ) ہے۔ اور مذہبی روایات محض توہمات ہیں کیونکہ وہ قابلِ تصدیق (verifibale) نہیں ہیں اور اللہ، فرشتے نظر نہیں آتے لہٰذا آسمانی وحی سے نازل ہونے والا علم، علم ہی نہیں ہے، یہ محض غیر مصدقہ معلومات کا پلندہ ہے جو عقیدے کے تحکم (dogma) پر مبنی ہے نہ کہ علم حقیقی پر۔	علم کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ وہی علم کا خالق ہے اور انسان وکائنات کا بھی۔ اور مخلوق کو خالق سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا علمِ ہدایت فرشتے کے ذریعے پیغمبر کو بھجواتا ہے اور پیغمبر اس کی تشریح وتفسیر کرتا اور اس پر عمل کر کے دکھاتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں علم کا منبع ہے وحی یا قرآن وسنت۔ عقل کا بھی اس میں کردار ہے لیکن ذیلی اور ماتحت یعنی عقل اور حواس سے حاصل ہونے والا علم بھی صحیح ہے اگر وہ وحی کے مطابق ہو اور اس کے خلاف نہ ہو۔

مغرب کا ورلڈ ویو	اسلام کا ورلڈ ویو
ا۔ تصورِ الٰہ کوئی خدا، کوئی بالاتر ہستی ایسی نہیں ہے جسے انسان پر غلبہ وقدرت حاصل ہو اور جس کی عبادت واطاعت انسان پر فرض ہو۔	**ا۔ تصورِ الٰہ** ایک اللہ تعالیٰ انسان، کائنات اور ساری مخلوق کا خالق، مالک رازق اور ہادی ہے۔ وہ اس کے نفع ونقصان، غم اور خوشی اور زندگی وموت پر قادر ہے۔ وہی معبود اور مطاع ہے۔
مغرب کا ورلڈ ویو	**اسلام کا ورلڈ ویو**
۲۔ تصورِ انسان انسان اپنا خدا خود ہے۔ وہ خود مختار اور مختارِ مطلق ہے، وہ اپنی مرضی کا آپ مالک ہے۔ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ وہ کسی الٰہ کا عبد اور مطیع نہیں ہے جس کے احکام کو ماننا اس کے لیے ضروری ہو۔	**۲۔ تصورِ انسان** انسان اللہ تعالیٰ کا عبد ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت ہی زیبا ہے۔ اور وہ اللہ کا خلیفہ بھی ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں تصرف کا اور حق کے رد و قبول کا جو اختیار دیا ہے، انسان اس کا استعمال اللہ کی مرضی کے مطابق کرتا ہے نہ کہ اس کے احکام کی مخالفت کرکے۔
۳۔ تصورِ کائنات زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ لہٰذا اس دنیا کی کامیابی اور اس میں سہولتوں اور آسائشوں کا حصول ہی انسان کا مقصدِ زندگی اور ہدفِ زندگی ہونا چاہیے۔ جہاں تک اس زندگی کے بعد کسی اور آنے والی زندگی کا تعلق ہے تو عقل اور سائنس سے اس کا ثبوت نہیں ملتا لہٰذا مغربی تہذیب اس سے اعتناء نہیں کرتی۔	**۳۔ تصورِ کائنات** موجودہ زندگی عارضی ہے۔ یہ دار الامتحان ہے۔ انسان کا امتحان اس میں ہے کہ وہ زندگی یہاں اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق گزارے تاکہ آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہو۔ آخرت کی زندگی چونکہ دائمی ہے اور نتیجہ کی جگہ ہے لہٰذا آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح حاصل ہے۔

اسلام اور مغربی تہذیب کے بنیادی افکار اور ان دونوں کے ورلڈ ویو کے تقابلی مطالعے سے بالکل شیشے کی طرح عیاں ہے کہ یہ دونوں تہذیبیں اور ان کے بنیادی افکار نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں، ایک دوسرے کے برعکس ہیں، ان میں کوئی تقارب نہیں بلکہ ان میں بُعد ہے، دوری ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ بُعد المشرقین ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے متوازی طرزِ حیات ہیں جن کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی تہذیب کے اساسی افکار اور اس کا ورلڈ ویو کفر والحاد پر مبنی ہے۔ اور جب یہ نظریات کفر والحاد پر مبنی ہیں تو منطقی طور پر اس کے ماننے والے ملحد اور کافر ہیں اور شرعی لحاظ سے مغربی تہذیب کو کفر اور اس میں یقین رکھنے والوں کو کافر سمجھنا اور کہنا اور اُن سے کفار جیسا سلوک کرنا ایک شرعی تقاضا ہے۔

یہ بات اگرچہ بالکل واضح ہے لیکن ممکن ہے کہ غیر مانوس محسوس ہو اس لیے ہم اسے قرآن وسنت کے مزید دلائل سے واضح کریں گے۔

مبحث دوم: مغربی تہذیب کو ماننے والے اہل کتاب کافر ہیں

جیسا کہ ہم نے سطورِ بالا میں دیکھا کہ مغربی فکر وتہذیب کے اساسی افکار کفر والحاد پر مبنی ہیں لہٰذا اہل مغرب ان کفریہ اور شرکیہ اساسات کو ماننے کی وجہ سے بھی کافر ہیں اور بطور اہل کتاب بھی وہ کافر ہیں کیونکہ قرآن حکیم کی رو سے کافر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کو سِرے سے نہیں مانتے یا اُس کے ساتھ شرک کرتے ہیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں مکہ کے کافر تھے۔ کافروں کی دوسری قسم وہ ہے جو کسی سابق نبی یا رسول یا اُس پر نازل کی ہوئی کتاب کو مانیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن حکیم کی تکذیب کریں۔ یہ کافر وہ ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں یہود ونصاریٰ یا اہل کتاب کہلواتے تھے۔ یہ بات جو ہم نے کہی ہے قرآن وسنت کی نصوص سے بالکل واضح ہے لیکن ہم عام لوگوں کے شرح صدر کے لیے قرآن وسنت کے حوالے دینا

مناسب سمجھتے ہیں۔

❁ توحید، رسالت اور آخرت کو نہ ماننے والے کافر ہیں

۔ ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ [آل عمران ۳:۱۳]

''تمہارے لیے ان دو گروہوں (کے واقعے) میں بڑی نشانی ہے جو ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے راستے میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا جو اپنے آپ کو کھلی آنکھوں ان سے کئی گنا زیادہ دیکھ رہا تھا۔ اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی مدد سے تائید کرتا ہے۔ بیشک اس واقعے میں آنکھوں والوں کے لیے عبرت کا بڑا سامان ہے۔''

۔ ﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ [انفال ۸:۱۲]

''وہ وقت جب تمہارا رب فرشتوں کو وحی کے ذریعے حکم دے رہا تھا کہ: میں تمہارے ساتھ ہوں، اب تم مومنوں کے قدم جماؤ میں کافروں کے دلوں میں رعب طاری کر دوں گا، پھر تم گردنوں کے اوپر وار کرو، اور ان کی انگلیوں کے ہر ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔''

۔ ﴿ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [التوبہ ۹:۲۶]

''پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل کی اور ایسے لشکر اتارے جو تمہیں نظر نہیں آئے، اور جن لوگوں نے کفر اپنا رکھا تھا، اللہ نے ان کو سزا دی، اور ایسے کافروں کا یہی بدلہ ہے۔''

۔ ﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾ [الرعد ۱۳:۴۳]

''اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: تم پیغمبر نہیں ہو۔ کہہ دو کہ: میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ کافی ہے، نیز ہر وہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔''

۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَاۗءَۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الحج ۲۲:۲۵]

''بیشک وہ لوگ (سزا کے لائق ہیں) جنہوں نے کفر اپنا لیا ہے اور جو دوسروں کو اللہ کے راستے سے اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں جسے ہم نے لوگوں کے لیے ایسا بنایا ہے کہ اس میں وہاں کے باشندے اور باہر سے آنے والے سب برابر ہیں۔ اور جو کوئی شخص اس میں ظلم کر کے ٹیڑھی راہ نکالے گا، ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔''

۔ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ [فصلت ۴۱:۲۶]

''اور یہ کافر (ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ: اس قرآن کو سنو ہی نہیں، اور اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو تا کہ تم ہی غالب رہو۔''

۔ ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَاۗءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَــــُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِــيْمًا﴾ [الفتح ۴۸:۲۵]

''یہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا، اور تمہیں مسجد حرام سے روکا، اور قربانی کے

جانوروں کو جو ٹھہرے ہوئے کھڑے تھے، اپنی جگہ پہنچنے سے روک دیا، اور اگر کچھ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں (مکہ میں) نہ ہوتیں جن کے بارے میں تمہیں خبر بھی نہ ہوتی کہ تم انہیں پیس ڈالو گے، اور اس کی وجہ سے بیخبری میں تم کو نقصان پہنچ جاتا (تو ہم ان کافروں سے تمہاری صلح کے بجائے جنگ کروا دیتے، لیکن ہم نے جنگ کو اس لیے روکا) تاکہ اللہ جس کو چاہے، اپنی رحمت میں داخل کر دے۔ (البتہ) اگر وہ مسلمان وہاں سے ہٹ جاتے تو ہم ان (اہل مکہ) میں سے جو کافر تھے، انہیں دردناک سزا دیتے۔''

* **توحید، رسالت، آخرت کو ماننے والے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کو نہ ماننے والے اہل کتاب بھی کافر ہیں**

۔﴿وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ﴾[البقرہ ۲:۴۱]

''اور جو کلام میں نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ جبکہ وہ اس کتاب (یعنی تورات) کی تصدیق بھی کر رہا ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم ہی سب سے پہلے اس سے کفر کرنے والے نہ بن جاؤ اور میری آیتوں کو معمولی سی قیمت لے کر نہ بیچو اور (کسی اور کے بجائے) صرف میرا خوف دل میں رکھو۔''

۔﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۲۱﴾[آل عمران ۳:۲۱]

''جو لوگ اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور انصاف کی تلقین کرنے والے لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں، ان کو دردناک عذاب کی "خوشخبری" سنا دو۔''

۔﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ

سَبِيْلًا ﴿١٥٠﴾ [النساء ۴:۱۵۰]

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے اور کہتے ہیں کہ کچھ (رسولوں) پر تو ہم ایمان لاتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں، اور (اس طرح) وہ چاہتے ہیں کہ (کفر اور ایمان کے درمیان) ایک بیچ کی راہ نکال لیں۔''

۔﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾ [البقرہ ۲:۹۱]

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کلام اتارا ہے اس پر ایمان لے آؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو (صرف) اسی کلام پر ایمان رکھیں گے جو ہم پر نازل کیا گیا، (یعنی تورات) اور وہ اس کے سوا (دوسری آسمانی کتابوں) کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ بھی حق ہیں (اور) جو کتاب ان کے پاس ہے وہ اس کی تصدیق بھی کرتی ہیں۔ (اے پیغمبر) تم ان سے کہو کہ اگر تم واقعی (تورات) پر ایمان رکھتے تھے تو اللہ کے نبیوں کو پہلے زمانے میں کیوں قتل کرتے رہے؟۔''

۔﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾ [آل عمران ۳:۱۱۲]

''وہ جہاں کہیں پائے جائیں، ان پر ذلت کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے، الا یہ کہ اللہ کی طرف سے کوئی سبب پیدا ہو جائے یا انسانوں کی طرف سے کوئی ذریعہ نکل آئے جو ان کو سہارا دیدے، انجام کار وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے، اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ (نیز) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے، اور ساری حدیں پھلانگ جایا کرتے تھے۔"

۔﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [آل عمران ۳:۷۲]

"اہل کتاب کے ایک گروہ نے (ایک دوسرے سے) کہا ہے کہ: جو کلام مسلمانوں پر نازل کیا گیا ہے اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آؤ، اور ان کے آخری حصے میں اس سے انکار کر دینا، شاید اس طرح مسلمان (بھی اپنے دین سے) پھر جائیں۔"

۔﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [آل عمران ۳:۹۸]

"کہہ دو کہ: اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو؟ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سب کا گواہ ہے۔"

۔﴿وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ﴾ [المائدہ ۵:۶۱]

"اور جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، حالانکہ یہ کفر لے کر ہی آئے تھے، اور اسی کفر کو لے کر باہر نکلے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ کیا کچھ چھپاتے رہے ہیں۔"

۔﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [المائدہ ۵:۷۳]

"وہ لوگ (بھی) یقینا کافر ہو چکے ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے کہ: اللہ تین میں کا تیسرا

ہے حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور اگر یہ لوگ اپنی اس بات سے باز نہ آئے تو ان میں سے جن لوگوں نے (ایسے) کفر کا ارتکاب کیا ہے، ان کو دردناک عذاب پکڑ کر رہے گا۔''

۔﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾[النساء ۴:۴۶]

''یہودیوں میں سے کچھ وہ ہیں جو (تورات) کے الفاظ کو ان کے موقع محل سے ہٹا ڈالتے ہیں، اور اپنی زبانوں کو توڑ مروڑ کر اور دین میں طعنہ زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں: سمعنا وعصینا۔ اور اسمع غیر مسمع۔ اور راعنا۔ حالانکہ اگر وہ یہ کہتے کہ: سمعنا واطعنا اور اسمع وانظرنا۔ تو ان کے لیے بہتر اور راست بازی کا راستہ ہوتا لیکن ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر پھٹکار ڈال رکھی ہے، اس لیے تھوڑے سے لوگوں کے سوا وہ ایمان نہیں لاتے۔''

❁ کفار کے ساتھ ہمارا سلوک کیسا ہونا چاہیے؟

۱۔ کفار اُمت دعوت ہیں

مطلب یہ کہ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کفار تک دین کی دعوت پہنچائیں اور انہیں سمجھائیں کہ عقل وفطرت کا تقاضا یہی ہے کہ خالق کائنات کو مانا جائے اور اس کی دی ہوئی ہدایت کی پیروی کی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (ﷺ) کو تلقین کی کہ:

۔﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾[النحل ۱۶:۱۲۵]

''اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو، اور (اگر بحث کی نوبت آئے تو) ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو

بہترین ہو۔ یقیناً تمہارا پروردگار ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بھٹک گئے ہیں، اور ان سے بھی خوب واقف ہے جو راہ راست پر قائم ہیں۔''

۔ ﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ [الفرقان ۲۵:۵۲]

''لہٰذا (اے پیغمبر) تم ان کافروں کا کہنا نہ مانو، اور اس قرآن کے ذریعے ان کے خلاف پوری قوت سے جدوجہد کرو۔''

۲۔ کفار کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا

مطلب یہ کہ کفر اور ایمان ایک دوسرے سے متضاد ہیں، وہ یکجا نہیں ہوسکتے۔ ایک آدمی یا تو حق کو قبول کرنے والا ''مسلم'' ہوگا یا اُسے ردّ کرنے والا ''کافر''۔ کفر اور ایمان میں کوئی درمیانی راستہ اختیار نہیں کیا جاسکتا اور نہ کفر سے سمجھوتہ کیا جاسکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

۔ ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝﴾ [الکافرون ۱۰۹:۱ تا ۶]

''تم کہہ دو کہ: اے حق کا انکار کرنے والو۔ مَیں ان چیزوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی مَیں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ مَیں (آئندہ) اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی مَیں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

۳۔ اللہ اور اس کی ہدایت کا انکار بے عقلی ہے۔

مطلب یہ کہ انسانی فطرت اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو مانے اور دنیا کی زندگی اُس کی ہدایت کے مطابق گزارے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُس نے اپنی ذات

اور حق کا ادراک انسان کی فطرت میں رکھا ہے:

۔ ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾[الاعراف ۷:۱۷۲]

''اور (اے رسول! لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ) جب تمہارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا تھا، اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا، (اور پوچھا تھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ: کیوں نہیں؟ ہم سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ (اور یہ اقرار ہم نے اس لیے لیا تھا) تا کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ: ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔''

۔ ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾[الشمس ۹۱:۷،۸]

''اور انسانی جان کی، اور اس کی جس نے اسے سنوارا۔ پھر اس کے دل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اس کے لیے بُرائی کی ہے، اور وہ بھی جو اس کے لیے پرہیز گاری کی ہے۔''

نیز فرمایا کہ ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہوئے یا دنیاوی مفادات کے لیے حق کا انکار شرفِ انسانیت کے خلاف ہے اور یہ جانوروں جیسی حرکت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو گدھے اور کتے سے تشبیہ دی ہے:

۔ ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ [الجمعہ ۶۲:۵]

''جن لوگوں پر تورات کا بوجھ ڈالا گیا، پھر انہوں نے اس کا بوجھ نہیں اٹھایا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہو۔ بہت بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت تک نہیں

پہنچاتا۔‘‘

۔﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾
[الاعراف۷:۱۷۶]

’’اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اسے سربلند کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا، اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا رہا، اس لیے اس کی مثال اس کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تم اس پر حملہ کرو تب بھی وہ زبان لٹکا کر ہانپے گا، اور اگر اسے (اس کے حال پر) چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکا کر ہانپے گا۔ یہ ہے مثال ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے۔ لہٰذا تم یہ واقعات ان کو سناتے رہو، تاکہ یہ کچھ سوچیں۔‘‘

۴۔ اللہ اور اُس کی ہدایت کا انکار اللہ سے سرکشی اور بغاوت ہے۔

مطلب یہ کہ انسان کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کا اور اس کی ہدایت کا انکار کرے اور اپنی من مانی کرے کیونکہ اللہ کے مقابلے میں اپنی مرضی کرنا شیطانی اور طاغوتی فعل ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

۔﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ [المائدہ۵:۵۹،۶۰]

’’تم (ان سے) کہو کہ: اے اہل کتاب! تمہیں اس کے سوا ہماری کون سی بات بری لگتی ہے کہ ہم اللہ پر اور جو کلام ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو پہلے اتارا گیا تھا اس پر ایمان لے

آئے ہیں، جبکہ تم میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں؟ (اے پیغمبر ان سے) کہو کہ: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ (جس بات کو تم برا سمجھ رہے ہو) اس سے زیادہ برے انجام والے کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پھٹکار ڈالی، جن پر اپنا غضب نازل کیا، جن میں سے لوگوں کو بندر اور سور بنایا، اور جنہوں نے شیطان کی پرستش کی، یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا بھی بدترین ہے اور وہ سیدھے راستے سے بھی بھٹکے ہوئے ہیں۔''

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ [یس ۳۶: ۶۰ تا ۶۲]

''اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمہیں یہ تاکید نہیں کر دی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ تم میری عبادت کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شیطان نے تم میں سے ایک بڑی خلقت کو گمراہ کر ڈالا۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے؟''

۵۔ کافروں سے قتال کا حکم

کافروں سے قتال کا حکم دو معنوں میں ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کریں اور ان پر حملہ آور ہوں تو مسلمانوں پر اپنا دفاع واجب ہے۔ اور دوسرا کافر حکمرانوں کی طاقت کو توڑنے کے لیے تاکہ عامۃ الناس غیر جانبدارانہ ماحول میں حق کی قبولیت یا عدم قبولیت کا فیصلہ کر سکیں جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ [البقرہ ۲: ۱۹۱]

''اور تم ان لوگوں کو جہاں پاؤ قتل کرو، اور انہیں اس جگہ سے نکال باہر کرو جہاں سے

انہوں نے تمہیں نکالا تھا، اور فتنہ قتل سے زیادہ سنگین برائی ہے، اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس اس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں، ہاں اگر وہ تم سے اس میں لڑائی شروع کردیں تو تم ان کو قتل کر سکتے ہو، ایسے کافروں کی سزا یہی ہے۔''

۔﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾[البقرہ۲:۱۹۳]

''اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو (سمجھ لو کہ) تشدد سوائے ظالموں کے کسی پر نہیں ہونا چاہیے۔''

۔﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾[التوبہ۹:۷۳]

''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو، اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''

٦۔ اہل کتاب کفار سے جنگ کا حکم

۔﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾[التوبہ۹:۲۹]

''وہ اہل کتاب جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ یوم آخرت پر اور جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے، اور نہ دین حق کو اپنا دین مانتے ہیں ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔''

٧۔ تمام کافر جہنم میں جائیں گے

۔﴿يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ [العنکبوت۲۹:۵۴]

''یہ تم سے عذاب کی جلدی مچا رہے ہیں، اور یقینا جہنم ان کو گھیرے میں لے لے گی۔''

۔﴿وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ [غافر ۴۰:۶]

''اور اسی طرح جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، ان کے بارے میں تمہارے پروردگار کی یہ بات بھی پکی ہو چکی ہے کہ وہ دوزخی لوگ ہیں۔''

۔﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ [التغابن ۶۴:۱۰]

''اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہوگا، اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا وہ دوزخ والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''

ان دلائل سے واضح ہے کہ مغربی تہذیب کے حامل لوگ جن نظریات میں یقین رکھتے ہیں وہ سراسر کفر ہیں اور توحید، رسالت اور آخرت کے نقیض ہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم یہود و نصاریٰ کو (جو آج اس مغربی تہذیب کے علمبردار ہیں) ان کے ناقص عقیدۂ توحید اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ اور قرآن حکیم کو ردّ کرنے کی وجہ سے صریحاً اور بار بار کافر قرار دیتا ہے۔ لہٰذا مغربی تہذیب کے حامل لوگوں کے کافر ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

دوسری دلیل

مغربی تہذیب وضعی دین ہے

''دین'' عربی لفظ ہے جس کے لغوی معانی میں سے ایک بنیادی معنی راستے کے ہیں۔[1] مطلب مطلب یہ کہ وہ راستہ جس پر چل کر زندگی گزاری جائے۔

[1] ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، جلد ۱۳، صفحہ ۱۶۶

''شریعت'' کا لفظ بھی تقریباً اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔لغت میں اس کے معنی ہیں وہ راستہ جس پر چل کر جانور پانی پینے کے منبع (جوہڑ، جھیل، ندی، نالہ، دریا، سمندر وغیرہ) تک جاتے ہیں۔[1] جانوروں کے پانی کے منبع تک بار بار جانے سے جو راستہ بن جاتا ہے اسے شارع کہتے ہیں (جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ یہ شارع عام نہیں ہے، یا لاہور میں مال روڈ کا نام تبدیل کر کے شارع قائد اعظم رکھ دیا گیا ہے) اور پانی پر چونکہ جانداروں کی زندگی کا مدار ہوتا ہے یعنی انہیں پانی نہ ملے تو وہ مر جاتے ہیں، زندہ نہیں رہ سکتے لہٰذا شریعت کا معنی ہوا ''شاہراہِ حیات''، یعنی وہ صحیح راستہ جس پر چلنا زندگی کی بقاء کی ضمانت ہے اور جس پر نہ چلنا گویا زندگی اور جینے کے خاتمے کا سبب ہے۔

خلاصہ یہ کہ لغوی لحاظ سے دین کے معنی ہیں راستہ، منہج، طریقہ۔اسے طرز زندگی یا نظام حیات بھی کہا جا سکتا ہے۔

دین کا لفظ قرآن حکیم میں بکثرت استعمال ہوا ہے، دین اسلام کے معنوں میں بھی اور دین ماسوا اللہ کے لیے بھی۔

دینِ اسلام

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اسلام کو 'دین' قرار دیتے ہوئے فرمایا ''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ''[2] یعنی دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اسلام سے کیا مراد ہے؟ اسلام کے لفظی معنی تسلیم کرنے اور سلامتی کے ہیں[3] اردو میں کہتے ہیں۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے تو اسے کئی صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے جیسے علم[4]، حواس یعنی سننے کو کان، دیکھنے کو آنکھیں اور

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، جلد ۸، صفحہ ۱۷۵

[2] آل عمران ۳:۱۹

[3] ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت، جلد ۱۲، صفحہ ۱۸۹

[4] العلق ۹۶:۱ تا ۵

سوچنے کو دل و دماغ[1]، اچھائی برائی کی تمیز[2] اور ذات باری کے ادراک کی صلاحیت [3] اور یہ سب دے کر اسے اختیار دے دیا کہ وہ چاہے تو اللہ کو مانے، اس کی اطاعت کا دم بھرے اور زمین میں زندگی اس کی مرضی کے مطابق گزارے یا نہ چاہے تو اللہ کو اور اس کی ہدایت کو نہ مانے۔ اپنی آزاد مرضی سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور کبریائی کو بلا شروط وحدود تسلیم کر لینا، پیغمبروں کے ذریعے بھیجی گئی اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا اور آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دینا، یہ ''اسلام'' ہے اور جو شخص اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دے اور ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا رویہ اختیار کر لے وہ ہے ''مسلم'' یعنی اسلام کو ماننے والا اور اس کے مطابق زندگی گزارنے والا اور اس پر عمل کرنے والا۔ یہ ہے 'دین' کا اسلامی تصور۔

لفظ 'دین' کا استعمال

اور جو آدمی اللہ کی الوہیت اور کبریائی کو نہ مانے اور اس کے آگے سر اطاعت بلا شروط و حدود خم نہ کرے بالفاظ دیگر وہ اللہ کی مرضی کو نہ مانے اور اپنی مرضی کرے اور اپنی عقل پر بھروسہ کرے وہ ہے'' کافر'' یعنی اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرنے والا اور اللہ کی ہدایت کے پیکیج کو نہ ماننے والا۔ کافر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں انکار کرنے والا یعنی وہ شخص جو اللہ کا اور اس کی ہدایت کا انکار کرے۔ یہ ہے دین کا غیر اسلامی تصور۔ جو لوگ اللہ کے عطا کردہ طرز زندگی یعنی دین کو نہ مانیں اور اپنی زندگی گزارنے کا پیکیج اپنی مرضی سے تیار کریں تو یہ ہوگا ان کا اپنا وضع کردہ دین یا طرز زندگی اور نظام حیات۔

خلاصہ یہ کہ مسلم وہ ہے جو زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گزارے اور غیر مسلم یا کافر وہ ہے جو زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارے۔ جو شخص زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق

---

[1] الاسراء ۱۷:۳۶

[2] الشمس ۹۱:۸

[3] الاعراف ۷:۱۷۲

گزارے وہ ہے اللہ کے دین (یا سماوی/آسمانی دین) کا پیروکار اور جو شخص زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارے وہ گویا اپنے وضع کردہ (وضعی) دین کا پیروکار ہے۔

فرد کے اس رویے کا اطلاق قوم، معاشرے اور تہذیب پر بھی ہوتا ہے یعنی جو قوم، معاشرہ اور تہذیب اللہ کی مرضی اور اس کی بالادستی کو مانے وہ مسلم قوم، مسلم معاشرہ اور مسلم تہذیب ہے۔ اور جو قوم، معاشرہ اور تہذیب زندگی اپنی مرضی اور اپنی عقل کے مطابق گزارے وہ کافر قوم، کافر معاشرہ اور کافر تہذیب ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ دین کا مطلب ہے زندگی گزارنے کا راستہ، طریقہ اور منہج اور اس کی دو بڑی اقسام ہیں: ایک دین الٰہی یا دین سماوی اور دوسرا دین وضعی یعنی انسانوں کا اپنا بنایا ہوا دین اور نظامِ حیات۔ اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے اور مغربی تہذیب اہل مغرب (امریکہ و یورپ، وغیرہ) کا دین ہے۔

۲۔ مسلمان دین کو، دین الٰہی، یا دین سماوی کے معنی میں استعمال کرنے کے عادی ہیں لہٰذا 'وضعی دین' کا لفظ انہیں اوپرا لگتا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اس کے ''وضعی'' ہونے میں لغوی لحاظ سے کوئی مانع نہیں۔ پھر قرآن حکیم نے بھی دین کا لفظ ''وضعی'' یا غیر الٰہی/غیر سماوی کے معانی میں کئی دفعہ استعمال کیا ہے مثلاً فرمایا:

۔ ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ [الکافرون ۱۰۹:۶]

یعنی اے پیغمبر! کفار سے کہہ دیجیے کہ تمہارا دین تمہارے لیے ہے اور میرا دین میرے لیے۔

۔ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [الفتح ۴۸:۲۸]

یعنی جتنے بھی غیر اسلامی ادیان اور غلط نظام ہائے حیات اور طریقہ ہائے زندگی ہیں، ان سب پر دین اسلام کو غالب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ہدایت اور

دین حق دے کر بھیجا تھا۔

۔ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران ۳: ۸۵] مطلب یہ کہ جو آدمی اسلام کے علاوہ کسی اور منہج فکر وعمل کو 'دین' بنائے گا، وہ اللہ کے نزدیک نا قابل قبول ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کئی احادیث میں بھی لفظ 'دین' اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان اور نظام ہائے حیات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

"قَالَ ابْنُ شِهَابٍ:فَأَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ،أَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ: وَاسْتَأْجَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ رَجُلًا مِنْ بَنِي الدِّيلِ هَادِيًا خِرِّيتًا، وَهُوَ عَلَى دِينِ كُفَّارِ قُرَيْشٍ، فَدَفَعَا إِلَيْهِ رَاحِلَتَيْهِمَا، وَوَاعَدَاهُ غَارَ ثَوْرٍ بَعْدَ ثَلَاثِ لَيَالٍ بِرَاحِلَتَيْهِمَا صُبْحَ ثَلَاثٍ."[۱]

''حضرت عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ (ہجرت کے وقت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر صدیقؓ نے بنی دیل کے ایک شخص کو اپنا گائیڈ مقرر کیا تھا جو کہ کفار کے دین پر تھا۔ دونوں نے اس کو اپنی سواریاں دیں اور تین راتوں کے بعد صبح کو اُسے اپنی سواریوں سمیت طلب کر لیا۔''

ان آیات وحدیث سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے علاوہ جتنے مناہجِ فکر وعمل، نظام ہائے حیات اور طرز ہائے زندگی ہیں وہ بھی ''دین'' ہیں لیکن اللہ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہیں اور اللہ کے نزدیک صحیح دین یعنی زندگی گزارنے کا صحیح منہج، صحیح طریقہ اور صحیح اسلوب صرف اسلام ہی ہے۔ ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ دین سماوی اور الوہی بھی ہوسکتا ہے اور انسانوں کا اپنا وضع کردہ بھی۔

---

[۱] صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۲۲۶۴

کیا مغربی فکر و تہذیب کی اساس عیسائیت ہے؟

اس وقت تک ہم نے جو عرض کیا ہے اس سے واضح ہے کہ مغربی تہذیب اگر چہ خود کو ''تہذیب'' کہتی ہے 'دین' یا 'مذہب' نہیں لیکن درحقیقت وہ دین ہی ہے اور مکمل نظام حیات ہے جو انسانی عقل پر مبنی ہے اور خدا کے مقابلے میں انسان کی خدائی کا علمبردار ہے۔لہٰذا یہ کہنا کہ مغربی تہذیب عیسائیت کی پیداوار ہے نہ صرف غلط مبحث ہے بلکہ خلاف حقائق بھی ہے۔یہاں ہم اس نقطے کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں:

i۔ اگر چہ اہل کتاب سماوی دین کو مانتے ہیں لیکن قرآن حکیم واضح کرتا ہے کہ وہ صحیح دین سے انحراف کر چکے ہیں، کتاب اللہ کو بدل چکے ہیں لہٰذا ان کا تصور توحید و رسالت و آخرت کرپٹ ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے وہ نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی نہیں مانتے لہٰذا وہ بھی ایک لحاظ سے کافر (منکر مغربی) اور غیر مسلم ہیں لیکن ان میں اور ان کفار میں جو صاحب کتاب نہیں ہیں، بہر حال کچھ فرق ہے اور قرآن وسنت نے ان کے ساتھ کھانے پینے اور شادی کی اجازت دی ہے۔تاہم یہ بھی مشروط و محدود ہے ان کا ذبیحہ اسی وقت کھایا جاسکتا ہے جب اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔اور ان کی خواتین سے اسی وقت نکاح کیا جاسکتا ہے جب کہ وہ پاکباز ہوں۔یہ دونوں شرطیں آج کل مغربی دنیا کے نام نہاد عیسائیوں (اور یہودیوں) میں بالعموم نہیں پائی جاتیں لہٰذا ان کا اہل کتاب ہونا اور ہمارا ان کو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے خصوصی اہمیت اور حیثیت دینا بے معنی ہے۔

ii۔ ہم اوپر وضاحت کر آئے ہیں کہ مغربی تہذیب کی عمارت کی تعمیر عیسائیت کے ملبے پر ہوئی ہے۔مغربی تہذیب مذہب دشمن ہے۔وہ کسی سماوی ہدایت کو نہیں مانتی۔وہ اللہ، رسول، وحی، کتاب، آخرت کو تسلیم نہیں کرتی۔وہ مادہ پرستی، انسان پرستی، عقل پرستی اور نفس پرستی کی قائل ہے لہذا اس کا کسی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔اس نے اگر عیسائیت کو بالکل ختم نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عیسائیت کو مغلوب کر کے اسے کونوں کھدروں میں

دھکیل دیا ہے اور اسے فرد کی ذاتی اور روحانی زندگی تک محدود کر دیا ہے کہ وہ گھر بیٹھ کر یا ہفتے میں ایک دن چرچ جا کر گا کر دعا مانگ سکتے ہیں، انجیل کا مطالعہ کر سکتے ہیں، چرچ میں جا کر نکاح کر سکتے ہیں، پادری سے گناہوں کی معافی مانگ سکتے ہیں۔ کرسمس کی تقریب منا سکتے ہیں اور بس۔ اتنی سی عیسائیت کو مغربی تہذیب نے بمشکل برداشت کیا ہوا ہے اور وہ بھی قانونی سطح پر ورنہ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے اہل مغرب کی اکثریت عملاً اتنی سی عیسائیت پر بھی عمل نہیں کرتی۔ لہٰذا اس بات میں کوئی وزن نہیں بلکہ اس میں ایک فیصد بھی حقیقت نہیں کہ مغربی تہذیب عیسائیت کی پیداوار ہے۔ درحقیقت مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں یونان کی وحی مخالف اور عقل پرستانہ فکر و تہذیب پر استوار ہیں نہ کہ کسی سماوی دین پر۔

اسلام اور مغربی تہذیب کے بنیادی افکار اور ان دونوں کے ورلڈ ویو کے تقابلی مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان دونوں کے بنیادی افکار نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں، ایک دوسرے کے برعکس ہیں، ان میں کوئی تقارب وتوافق نہیں بلکہ ان میں بُعد ہے، دوری ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ بُعد المشرقین ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے متوازی طرزِ حیات ہیں جن کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔

تیسری دلیل

یہود و نصاریٰ، جو مغربی تہذیب کے علمبردار ہیں، اسلام اور مسلم دشمن ہیں

سطور سابقہ میں ہم نے دیکھا کہ مغربی فکر و تہذیب کفر ہے اور اسلام کے مقابلے میں دین ما سوا اللہ ہے۔ ہم نے یہ بھی ملاحظہ کیا کہ اس مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار یہود ونصاریٰ ہیں جو اہل کتاب ہونے کے باوجود قرآن حکیم کی رو سے کافر ہیں۔ اس تیسری دلیل میں ہم یہ دیکھیں گے کہ ان یہود و نصاریٰ کو، جو اس ملحدانہ فکر و تہذیب کے علمبردار ہیں، ان کے بارے میں قرآن وسنت بھی یہی بتاتے ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور عملاً بھی ان کا رویہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس دلیل کو

دو مباحث میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے مبحث میں ہم یہود و نصاریٰ کی اسلام و مسلم دشمنی کے بارے میں قرآن سنت کی تعلیمات ذکر کریں گے اور دوسرے میں عملی و زمینی حقائق پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

مبحث اوّل: یہود و نصاریٰ کی اسلام و مسلم دشمنی کے حوالے سے قرآن و سنت کی تعلیمات

یہاں قابل غور پہلو یہ ہے، اور وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے، کہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں قرآن و سنت نے مسلمانوں کو کچھ واضح ہدایات دی ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانوں کی سوچ، علم اور دانش سب میں غلطی کا امکان ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کے رسول کی سنت، بہر حال برحق ہے اور وہ صرف اور صرف سچ پر مبنی ہے۔

اس مبحث کو ہم نے دو بحوث میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی بحث میں ہم نے یہود و نصاریٰ کے حوالے سے قرآن حکیم کی نصوص جمع کی ہیں اور دوسری میں رسول کریم ﷺ کی سنت سے استشہاد کیا گیا ہے۔

بحث اوّل

یہود و نصاریٰ کی اسلام اور مسلم دشمنی کے حوالے سے قرآن حکیم کی تعلیمات

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ قرآن حکیم انسانوں کو دو بنیادی گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کو ماننے والے 'مسلم' کہلاتے ہیں اور نہ ماننے والے 'کافر'۔ کافروں کی بھی آگے دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو انبیاء کے لائے ہوئے 'دین' کو سرے سے ہی نہیں مانتے اور دوسرے وہ جو توحید، رسالت اور آخرت کو کسی نہ کسی صورت تو مانتے ہیں لیکن آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ کی طرف سے مبعوث کردہ رسول نہیں مانتے۔ ان کو قرآن 'اہل کتاب' گردانتا ہے جو یہود و نصاریٰ ہیں۔

قرآن یہود و نصاریٰ کے بارے میں واضح طور پر مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ وہ ان کے دشمن اور بدخواہ ہیں:

- یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرو

- ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ﴾ [المائدہ ۵: ۵۱]

''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ۔''

- وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں (تمہارے نہیں)

- ﴿بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ [المائدہ ۵: ۵۱]

''وہ (صرف) ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

- ﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ [المائدہ ۵: ۵۱]

''تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔''

- جو ان سے دوستی کرے وہ ظالم ہے اور ہدایت الٰہی سے محروم

- ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [المائدہ ۵: ۵۱]

''بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

چھٹی صدی ہجری کے عظیم اندلسی عالم، فقیہ، محدث اور سیرت النبی کی معروف کتاب ''الشفاء'' کے مؤلف قاضی عیاضؒ نے اپنی کتاب ''مصباح الارواح فی اصول الفلاح'' میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ان مسلمانوں کی تکفیر کی ہے جو یہودیوں کے ساتھ دوستی کا تعلق رکھیں اور ان کی حمایت کریں۔ [1]

- یہودی اور مشرک عیسائیوں سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کے دشمن ہیں

﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾ [المائدہ ۵: ۸۲]

---

[1] Encyclopaedia of Islam, vol. 10 P-122, Leiden, 2000

''ایمان والوں کے ساتھ دشمنی میں تم سب سے بڑھ کر یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے۔''

[جب کہ آج یہودی، عیسائی اور ہندو (مشرک) سب مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو کر گٹھ جوڑ کر چکے ہیں اور مل کر مسلمانوں کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔]

- اہل کتاب اور کفار اسلام دشمن ہیں ان سے دوستی نہ کرو

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [المائدہ ۵:۵۷]

''اے ایمان والو! اہل کتاب اور کافروں میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل بنالیا ہے، انہیں اپنا دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔''

- ان کو رازدار نہ بناؤ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''اے ایمان والو! غیر مسلموں کو (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو، کیونکہ سابقہ آیات میں انہی کا ذکر ہے) اپنا رازدار نہ بناؤ۔''

- یہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہتے ہیں

لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔''

- یہ تمہارے بدخواہ ہیں

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''وہ چاہتے ہیں کہ تم مشکل میں پڑو۔''

- ان کی مسلم دشمنی ان کے ظاہر سے بھی نمایاں ہے

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہے۔''

- اوران کے دلوں میں تو تمہارے خلاف زہر بھرا ہوا ہے

وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''اور جو بغض ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔''

- وہ تمہارے دوست نہیں ہیں

هٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ [آل عمران ۳:۱۱۹]

''تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے۔''

- وہ تمہارے خلاف غصے، نفرت اور انتقام سے بھرے بیٹھے ہیں

وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ [آل عمران ۳:۱۱۹]

''جب وہ تم سے الگ ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔''

- تمہاری خوشی وخوشحالی سے انہیں تکلیف ہوتی ہے

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ [آل عمران ۳:۱۲۰]

''اگر تمہارے حالات اچھے ہوں تو انہیں رنج ہوتا ہے۔''

- اور تمہاری تکلیف سے وہ خوش ہوتے ہیں

وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا [آل عمران ۳:۱۲۰]

''اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔''

- کفار سے دوستی نہ کرو

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ [النساء ۴:۱۴۴]

''اے ایمان والو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے خلاف اللہ کی کھلی حجت قائم کرالو۔''

- یہی عقل ودانش پر مبنی رویہ ہے

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ [آل عمران ۳:۱۱۸]

''اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تمہارے لیے تمام نشانیاں واضح کر دی ہیں۔''

- کافر باپ اور بھائی سے بھی دوستی نہ کرو

''يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ [التوبہ ۹:۲۳]

''اے ایمان والو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو عزیز رکھیں۔ اور تم میں سے جو انہیں اپنا دوست بنائیں گے تو ایسے لوگ ہی ظالم ہیں۔''

مطلب یہ کہ جو بھی دین اسلام کا انکار کرے خواہ وہ تمہارا باپ اور بھائی ہی ہو یا اہل کتاب ہوں یا مشرک ہوں ان سے دوستی نہ رکھو اور اگر تم ایسا کرو گے تو غلط کرو گے، خود اپنے ساتھ ظلم کرو گے۔

- یہودیوں سے دوستی رکھنے والے کا ایمان قبول نہیں

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ

يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۝ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝ [المائدہ۵: ۵۴تا۵۶]

''اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ کو کوئی پروا نہیں۔ وہ اور ایسے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ انہیں محبوب ہوگا۔ وہ مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں کے مقابلے میں سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔ اے مسلمانو! تمہارا دوست اللہ ہے، اس کا رسول ہے اور وہ ایمان والے تمہارے دوست ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ، اس کے رسول (ﷺ) اور ایمان والوں کو دوست بنائے تو وہ اللہ کی جماعت ہے جو غالب رہنے والی ہے۔''

[یہ آیات جنگ احزاب کے بعد نازل ہوئیں اور ان میں ان منافقین کے ایمان کو ردّ کیا گیا ہے جو ان یہودیوں کے ساتھ حلیفانہ اور دوستی کے تعلقات برقرار رکھنا چاہتے تھے جنھوں نے مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اکسایا اور مدینہ کے محاصرے میں ان کا ساتھ دیا تھا۔[1]

- یہود و نصاریٰ چاہتے ہیں کہ تم بے دین ہو جاؤ

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ [البقرہ۲: ۱۲۰]

---

[1] محمد شدید، منہج القرآن فی التربیۃ، ص: ۲۶۱، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۹۸۷ء

''یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کا مذہب اختیار نہ کرلو۔''

- اللہ کا راستہ ہدایت کا راستہ ہے، ان کا نہیں

قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَالۡهُدٰى ؕ

''ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی سچی ہدایت ہے۔''

- یہود ونصاریٰ کی پیروی اللہ کی ناراضی کا سبب

وَلَٮِٕنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِىۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ﴿۱۲۰﴾

''اور اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آجانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ مددگار۔''

بحث دوم:

یہود ونصاریٰ کی اسلام دشمنی کے حوالے سے سنت رسول (ﷺ) کی رہنمائی

نبی کریم ﷺ کے بہت سے فرمودات سے بھی اس قرآنی نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے بلکہ مختلف واقعات کے تتبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ مستقل مسلک تھا کہ یہود ونصاریٰ کے رویے کی وجہ سے ان کے ساتھ ہم آہنگی اختیار نہ کی جائے بلکہ ان کی ہمیشہ مخالفت کی جائے تاکہ مسلمانوں کی اپنی مستقل حیثیت اور انفرادیت کا اظہار ہو اور یہ پختہ ہو جائے۔ چنانچہ بہت سی احادیث شروع ہی اس جملے سے ہوتی ہیں کہ "خالفوا الیھود والنصاری"[1] چند ایک واقعات بطور مثال پیش خدمت ہیں:

- مدینہ میں یہودیوں میں رواج تھا کہ حیض کے دنوں میں عورت کا مکمل بائیکاٹ

[1] مسند احمد بن حنبل، ۵/ ۲۶۴، ۲۶۵

کر دیتے تھے اور گھر میں اس سے بول چال، اٹھنا بیٹھنا اور لینا دینا بھی بند کر دیا جاتا تھا۔ آپ ﷺ کے علم میں یہ بات لائی گئی تو فرمایا یہ غلط ہے صرف جنسی فعل منع ہے۔ باقی سارے معاملات نارمل انداز سے بجالاؤ اور عورتوں کو اچھوت نہ بناؤ۔ (۱)

- یہودی بڑھاپے میں داڑھی اور سر کے سفید بال نہیں رنگتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہود کی مخالفت کرو اور اپنے بال رنگا کرو۔ (۲)

- مکہ میں یہ ممکن تھا کہ نماز اس طرح ادا کی جائے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوں لیکن مدینہ میں یہ صورت ممکن نہ رہی۔ یہود کا قبلہ چونکہ بیت المقدس تھا لہٰذا نبی کریم ﷺ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس نہ ہو بلکہ کعبہ مشرفہ ہو۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے بہت دعائیں کیں اور مضطرب رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی امت کے لیے کعبہ کو قبلہ مقرر فرما دیا۔ (۳)

- مدینہ منورہ میں جب نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو دس محرم کا روزہ رکھنے کا حکم دیا تو انصار نے کہا کہ یہودی بھی اس یوم کو متبرک مان کر روزہ رکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم اگلے سال ۹ محرم کا بھی روزہ رکھیں گے (تاکہ یہود سے موافقت اور مطابقت ختم ہو جائے)۔ (۴) اور دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا کہ میں اگلے سال تک زندہ رہا تو ۹ محرم کا روزہ رکھوں گا۔ (۵)

- سورۃ فاتحہ کے آخر میں "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کے الفاظ آتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی ہے (اور وہ نماز کی ہر رکعت میں یہ دعا

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب جواز غسل الحائض

(۲) صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب من ذکر عن بنی اسرائیل

(۳) صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب التوجہ نحو القبلۃ حیث کان

(۴) سنن ابی داؤد، کتاب الصیام، باب ماروی عن عاشوراء الیوم التاسع

(۵) مسند احمد بن حنبل، ۲۳۶/۱

مانگتے ہیں) کہ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستے پر نہ چلا جن پر تیرا غضب ہوا اور جو گمراہ ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مغضوب اور ضالین سے مراد یہاں یہود و نصاریٰ ہیں۔ (۱)

- نبی کریم ﷺ نے فرمایا "لاتستضیئوا بنار المشرکین" (۲) یعنی غیر مسلموں کی آگ سے آگ نہ جلاؤ۔ مطلب یہ کہ ان سے معاشرتی تعلقات نہ رکھو، ان کے قریب نہ رہو، ان سے لینا دینا نہ رکھو، ان کی محتاجی سے بچو، اپنی ضروریات میں خود کفیل رہو وغیرہ اور امام حسن بصری سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے امور میں ان سے مشاورت نہ کرو۔ (۳)

- حضرت عمرؓ کو ایک دفعہ کہیں سے تورات مل گئی تو آپ نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے جب یہ دیکھا تو آپ ﷺ کو سخت ناگوار گزرا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً معذرت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج موسیٰ (علیہ السلام) خود بھی ہوتے تو انہیں میری پیروی کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ (۴)

- نبی کریم ﷺ کی اس تربیت اور ان احکام کا اثر یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو کتابیہ عورتوں سے شادی سے منع کر دیا اور جب آپ اپنے عہد حکومت میں شام کے دورے پر گئے تو آپ کے سامنے اہل کتاب میں سے حیرہ کے ایک ذہین اور تجربہ کار نوجوان کو پیش کیا گیا کہ آپ چاہیں تو اسے کاتب (چیف سیکرٹری سے ملتا جلتا ایک عہدہ) رکھ لیں لیکن آپ نے ناپسند کیا بلکہ آپ نے حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ گورنر بصرہ کو سختی سے حکم

---

(۱) سنن ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الفاتحۃ الکتاب

(۲) سنن نسائی، کتاب الزینۃ، باب لاتنقشوا علی خواتیمکم عربیاً

(۳) امام ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۱/ ۳۹۸، سہیل اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۶ء

(۴) سنن دارمی، مقدمہ، باب ۳۹

دیا کہ اپنے نصرانی کاتب کو ہٹادیں۔[1]

یادرہے کہ مسلمانوں نے جب ان علاقوں کو فتح کیا تو مقامی حکومتی مشینری (بیوروکریسی) کو مصلحتاً نہ بدلا اور نظام وہی چلاتے رہے۔ بعد میں اموی خلیفہ عبدالملک نے عربی کو سرکاری زبان قرار دیا اور سارا ریکارڈ عربی میں منتقل کیا گیا اور بیوروکریسی میں بھی تبدیلی آئی۔

قرآن حکیم کی ان آیات اور نبی کریم ﷺ کی ان احادیث کے تتبع سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ ورسول ﷺ نے یہود ونصاریٰ کی دوستی سے منع کیا ہے اور واضح لفظوں میں ہمیں یہ بتایا ہے کہ وہ ہمارے دشمن ہیں، خیر خواہ نہیں اور وہ ہمیں دین ودنیا میں ناکام بنانا چاہتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر اس کے باوجود ہم ان کے ساتھ دوستی رکھیں گے تو ہمارا شمار انہی کے ساتھ ہوگا اور ہم دنیا وآخرت میں اللہ کے عذاب اور ناراضی سے بچ نہ سکیں گے۔

مبحث دوم: یہود ونصاریٰ یعنی مغربی تہذیب کے علم بردار ممالک کی اسلام دشمنی

حق و باطل میں کشمکش اور مقابلہ فطری ہے اور ازل سے جاری ہے چنانچہ جب مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا تو اسلام مخالف قوتوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا اور دسویں صدی ہی سے سارے عیسائیوں نے مل کر مسلمانوں سے بیت المقدس چھیننے کی کوششیں شروع کردیں جو صلیبی جنگوں کی صورت میں کئی صدیوں تک جاری رہیں۔ اس دوران عیسائیوں کے مذہبی طبقے اہل مغرب کو جھوٹے سچے قصے سنا کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کے دل میں نفرت اور تعصب پیدا کرتے رہے۔ پھر ۱۴۵۳ء میں جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور عیسائیوں کا مذہبی مرکز بھی مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور عیسائی پادریوں کو وہاں سے نکال دیا گیا تو انہوں نے یورپ جا کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدت سے نفرت پھیلائی اور اُن کو انتقام پر ابھارا۔ اس طرح اسلام

[1] تفسیر ابن کثیر، ۲/ ۶۸

اور مسلم دشمنی عیسائی مغرب ممالک کے عوام وخواص کے دل ودماغ میں جڑ پکڑ گئی اور اُن کے خمیر کا ایک حصہ بن گئی۔ اس کا اظہار ان کے ادب اور لٹریچر میں بھی بخوبی ہوتا ہے اور بطور ثبوت وہ آج بھی موجود ہے اور بعض مصنف مزاج ادیبوں اور دانشوروں کو مسلمانوں سے اس سلسلے میں باقاعدہ معذرت کرنا پڑی۔

اسلام کے خلاف عیسائیوں اور یہودیوں کی یہ نفرت آج بھی امریکہ اور یورپ میں اسلاموفوبیا کی صورت میں موجود ہے جس میں عوام وخواص کی سطح پر آج بھی اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے مثلاً امریکی صدر بش نے جب عراق پر حملہ کیا تو اُس نے اسے صلیبی جنگ قرار دیا، علاوہ ازیں وہاں کے مستشرقین علمی سطح پر بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عمریں صرف کرتے رہے ہیں۔ شاخت اور دوسرے بہت سے مستشرقین نے احادیث کو من گھڑت اور غیر مستند قرار دینے کے لیے جدوجہد کی اور بعض نے اختلاف قراءات کو بہانہ بنا کر قرآن کو غیر مستند قرار دینے کے لیے علمی جدوجہد کی۔

الفرقان کے نام سے ایک جعلی قرآن بنا کر دنیا میں پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ امریکی پادری ٹیری جونز نے قرآن حکیم پر دہشت گردی کا الزام لگا کر اُسے سرعام جلایا۔ احادیث کو مشکوک ٹھہرانے کے لیے عالم اسلام کے متجدد سکالرز کی پشت پناہی کی جیسے پاکستان میں غلام احمد پرویز، جاوید احمد غامدی اور مصر میں احمد امین اور علی عبدالرازق وغیرہ۔

اسی طرح مسلمانوں کی اپنے رسول ﷺ سے محبت کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے کی خاطر مغربی آرٹسٹوں نے حضور ﷺ کے کارٹون بنائے اور دنیا کے مختلف اخبارات اور جرائد میں شائع کرتے رہے۔

اہل مغرب مسلم دشمنی کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی جھوٹا سچا موقع ملے تو وہ مسلمانوں سے دشمنی کریں مثلاً روس کی شکست کے بعد جب امریکہ اور نیٹو کے سامنے کوئی بڑا دشمن نہ رہا جو اُن کی اتنی بڑی فوج اور فوجی اداروں کے قیام

وتسلسل کا جواز بنتا تو اس موقع پر برنارڈ لیوس اور سموئیل ہنٹنگٹن (Samuel Huntington) جیسے دانشوروں اور فلسفیوں نے اہل مغرب کے سامنے تہذیبوں کی کشمکش کا نظریہ رکھا اور انہیں یہ نقطہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمان اور ان کی تہذیب اس وقت دنیا کی واحد تہذیب ہے جو مغربی تہذیب کے سامنے سرنگوں ہونے اور اُس کی بالادستی قبول کرنے کو تیار نہیں لہٰذا مسلمان اور ان کی تہذیب مغرب کی سب سے بڑی حریف ہے۔ اس طرح مغربی دانشوروں نے اپنی حکومتوں کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ روس اور اس کا سوشلزم نہیں رہا تو اب تم اسلام اور مسلمانوں کو اپنا دشمن بنالو چنانچہ اُس کے بعد 9/11 کا ڈرامہ رچایا گیا، عراق کو تباہ کیا گیا، افغانستان کا تورا بورا بنایا گیا اور لیبیا کو تباہ کیا گیا۔ شام اور یمن کو تباہ کیا جا رہا ہے اور پاکستان اور ایران پر شدید دباؤ جاری ہے۔

9/11 کو بنیاد بنا کر مغرب میں مسلمانوں کا ناطقہ بند کیا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ ظلم و ناانصافیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا جائے اور اس کی وجہ اسلامی تعلیمات کو قرار دیا جائے۔ اس سے یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اس طرح اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے کہ اہل مغرب کے قبول اسلام کی رفتار تھم جائے کیونکہ بہت سے مغربی تھنک ٹینک پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ اسلام امریکہ و یورپ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا دین (ریلیجن) ہے۔

چوتھی دلیل

مغربی تہذیب اور اس کے علمبردار ممالک اسلام اور مسلمانوں پر بالادستی کے خواہاں ہیں

مغربی تہذیب بحیثیت ایک نظام حیات کے دوسروں پر غلبے کی خواہاں ہے اور اس کے علمبردار ممالک علی الاعلان اپنی تہذیب، اس کے نظریات اور اداروں کو دوسروں خصوصاً مسلم معاشروں میں غالب و نافذ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے دلائل اور قرائن متعدد ہیں جن

میں سے چند اہم کا ذکر ہم یہاں اختصار سے کریں گے:

۱۔ یہود و نصاریٰ مذہبی حیثیت سے بھی اور مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے بھی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ وہ ان سے نفرت کرتے ہیں، ان سے تعصب برتتے ہیں، ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان کو کچلنا چاہتے ہیں، انہیں تباہ و برباد اور ذلیل و رسوا کرنا چاہتے ہیں، اور ان پر اپنا غلبہ اور بالادستی چاہتے ہیں۔ ان کو ہر وہ مسلمان لیڈر اور ہر وہ مسلمان ملک ایک آنکھ نہیں بھاتا جو مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے یا جو مسلم امہ کے ابھرنے کا خواب دیکھے یا مسلمان عوام کو تعلیم یافتہ اور طاقتور بنانا چاہے اور آزاد پالیسیاں اختیار کرے۔

۲۔ مغربی تہذیب کے علم بردار ممالک پلاننگ اور سازش سے ایسے اقدامات کرتے ہیں جن سے مسلمان ممالک اپنے ہاں شریعت نافذ نہ کر سکیں اور مسلم معاشرے اور ریاست پر اسلامی نظام حیات کا غلبہ نہ ہو بلکہ وہ مغربی تہذیب کے اصول و اقدار کو اپنائیں اور سیکولرزم، لبرل ازم، نیشنل ازم، جمہوریت اور نظام سرمایہ داری کو وہ اپنی زندگی کے بنیادی اصول کے طور پر قبول کر لیں۔

۳۔ مغربی ممالک کے قائم کردہ اداروں مثلاً ورلڈ بینک، آئی ایم ایف (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) ڈبلیو ٹی او (ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) نیو ورلڈ آرڈر اور اقوام متحدہ کے اداروں مثلاً سلامتی کونسل میں بڑے مغربی ممالک کی اجارہ داری ہے اور مسلمان جو دنیا کی ایک تہائی آبادی ہیں (تقریباً پونے دو ارب) انہیں وہاں نمائندگی ہی حاصل نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کے اکثر ذیلی ادارے مثلاً یونیسکو (UNESCO)، یونیسیف (UNICEF) اور ہیومن رائٹس کمشن (Human Rights Commission) تعلیم، حقوق نسواں اور بنیادی حقوق کے نام پر مغربی تہذیب کے ملحدانہ تصورات اور نظریات مسلمان ممالک پر مسلط کرتے ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک (جن پر یہودیوں کا کنٹرول ہے) کا بنیادی مقصد

ہی یہ ہے کہ وہ مسلمان ممالک کو سود کے شکنجے میں جکڑیں، انہیں مقروض بنا کر اُن کا معاشی استحصال کریں اور مسلمان ممالک میں بنیادی ضروریات زندگی مہنگی کر کے کروڑوں مسلمانوں کو نانِ جویں سے محروم کر دیں پھر ان کو مغربی تہذیب کی چکا چوند دکھا کر اُن کے ذہنوں میں نقش کریں کہ ترقی تو صرف مغربی تہذیب کی پیروی میں ہے، نہ کہ اسلام پر عمل کرنے میں۔

۴۔ مغرب مسلم ممالک کے حکمرانوں کو اپنا گماشتہ بنا کر اُن کے ذریعہ مغربی تہذیب کے تصورات اور اداروں کو مسلم معاشروں میں نافذ کراتا ہے مثلاً مغربی طرز کی جمہوریت کے ذریعے، مغربی طرز کی تعلیم کے ذریعے اور مغرب زدہ میڈیا کے ذریعے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑ کر اور خاندانی نظام کو توڑ کر وہ مغربی اخلاق و اقدار کو مسلم معاشرے میں نافذ کراتا ہے۔ مثلاً امریکہ علی الاعلان مسلم معاشروں میں ''جمہوریت'' کے فروغ کے لیے اپنے بجٹ میں رقوم مختص کرتا ہے اور پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا (ٹی وی، موبائل، یوٹیوب، فیس بک، ٹویٹر) کے ذریعے اپنے افکار و نظریات مسلم ممالک میں پھیلاتا ہے۔

۵۔ مغربی استعمار کو مسلم ممالک کو دوسری جنگ عظیم کے بعد مجبوراً آزادی دینا پڑی تو اب اس نے چولا بدل لیا اور امن کا ماسک چڑھا کر مختلف ٹیکنیکس (Techniques)، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے ذریعے آج تک مسلم ممالک کو قابو کیے ہوئے ہے، ان کو اپنے دباؤ میں رکھے ہوئے ہے اور ان پر اپنا غلبہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ان میں سے بعض اداروں کا ذکر ہم کر چکے ہیں لیکن نیو ورلڈ آرڈر اور گلوبلائیزیشن کا ذکر رہ گیا۔ گلوبلائیزیشن کا نعرہ صرف معاشی نہیں تھا جس میں یہ جھانسہ دیا گیا تھا کہ ساری دنیا کو معاشی طور پر باہم مربوط کر دیا جائے بلکہ یہ مغربی تہذیب کو عالمی اور آفاقی بنانے یعنی اس کی Universalization کی ایک اسکیم تھی تا کہ مغربی تہذیب کو عالمی سطح پر غالب کر دیا جائے۔ ہم صرف اس کے ایک دو پہلوؤں کی طرف یہاں اشارہ کریں گے۔

ایک: مغرب نے مسلمانوں کے ذریعے افغانستان میں روس کو شکست دلائی اور اسے توڑنے اور اس کے سوشلزم کو ناکام ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے پاکستان کی مدد سے چین سے تعلقات وابستہ کیے اور بتدریج روس اور چین میں سرمایہ دارانہ نظام، جمہوریت اور اپنی تہذیبی اقدار کے نفوذ میں کامیاب ہو گیا۔

دوم: اس نے عالمی سطح پر حقوق نسواں کی تحریک چلائی اور عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دلانے اور وومن ایمپاورمنٹ (Women Empowerment) کے نام پر اس نے قاہرہ، بیجنگ اور دوسری کئی جگہوں پر آزادیٔ نسواں کی کانفرنسیں کرائیں اور مسلم ممالک کے نمائندوں سے بھی اسلام کے نظام حیاء وعفت کے صریحاً خلاف اصول و اقدار کو منوانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کانفرنسوں میں گویا عورتوں کو فحاشی، عریانی اور زنا کی باقاعدہ اجازت دی گئی بلکہ اسے ان کا حق قرار دیا گیا۔ نیو ورلڈ آرڈر بھی اسی گلوبلائیزیشن کا ایک شاخسانہ اور ذریعہ تھا جس کے پیش نظر دنیا پر مغرب خصوصاً امریکہ کے غلبے کی راہ ہموار کرنا تھا۔

اگر ہم عالم اسلام پر مغرب کے غلبے کی حکمت عملی اور ٹیکنیکس کو سمجھنا چاہیں تو وہ یوں نظر آتی ہیں:

سیاسی شعبہ: مسلم ممالک میں اپنی مرضی کے حکمران لانا خواہ وہ بادشاہ ہوں، فوجی آمر ہوں یا برائے نام جمہوریت کے علمبردار۔ مسلمان ملکوں میں مغربی جمہوریت کا نفاذ۔ پونے دو ارب مسلمانوں کو سلامتی کونسل میں رکنیت نہ دینا۔ اتحاد امت کو ناکام بنانے کے لیے اس غرض سے بنائے گئے اداروں (جیسے اسلامی کانفرنس تنظیم [OIC]، موتمر عالم اسلامی، رابطہ عالم اسلامی وغیرہ) کو غیر موثر بنانا۔ کسی مسلم ملک میں اسلامی جماعتوں کو اقتدار میں نہ آنے دینا۔ فلسطین، کشمیر اور ایسے ہی دوسرے خطوں میں آزادی کی تحریکوں کو ناکام بنانا اور مسلم ممالک کو اندر سے توڑنے کے لیے ان کے اندر صوبوں کو خود مختاری اور آزادی دلوانا، خصوصاً جہاں عیسائی ہوں جیسا کہ انڈونیشیا اور سوڈان میں ہو چکا ہے۔ اگر مسلم ممالک میں کوئی اسلامی جماعت برسر اقتدار آ جائے تو فوج اور عدلیہ کے ذریعے اسے ناکام بنوانا جیسا کہ

الجزائر اور مصر میں ہو چکا ہے۔

معاشی شعبہ: مسلم ممالک کو ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے ذریعے قرضوں کے جال میں جکڑنا۔ مسلم ممالک میں اپنی مرضی کے اور اپنے تیار کردہ وزرائے خزانہ وتجارت کا تقرر۔ مسلم حکمرانوں کو بے ایمانی، کِک بیکس (kick Backs) اور انڈر انوائسنگ (Under Invoicing) کے گُر سکھانا، انہیں دیے گئے قرضے صحیح استعمال کرنے کی بجائے ذاتی اللّوں تللّوں میں انہیں ضائع کرنے کی ترغیب دلانا۔ انہیں ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا سرمایہ مغربی بنکوں میں جمع کرانے کی ترغیب دلانا۔ ان کے لیے آف شور کمپنیاں کھلوانے کا راستہ کھولنا۔ ان کی معیشت کو ڈالر سے وابستہ رکھنا۔ آئی ایم ایف کے ذریعے قرضہ نہ دینے کی دھمکی دے کر ان سے ناجائز سیاسی اور معاشی شرائط منظور کرانا وغیرہ۔

معاشرتی شعبہ: مسلم ممالک کے میڈیا میں نفوذ اور استثمار (Investment) یعنی رشوت کے ذریعے اسے اپنے قابو میں رکھنا اور اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا جیسے خاندانی نظام کو توڑنا، فحاشی عریانی اور زنا پھیلانا، نوجوانوں کو بداخلاقی اور بے راہ روی کی تعلیم دینا وغیرہ۔ بنیادی انسانی حقوق کے کمشن کے ذریعے مسلم ممالک میں انسانی حقوق کے ادارے قائم کرانا (جبکہ بنیادی انسانی حقوق کا چارٹر بہت سی غیر اسلامی دفعات پر مبنی ہے)۔ مسلمان عورتوں کو بے راہ روی سکھانے کے لیے ''حقوق نسواں'' کی تحریکیں مسلم معاشروں میں این جی اوز کے ذریعے چلوانا اور مسلمان حکمرانوں سے اس ضمن میں قانون سازی کرانا۔

تعلیمی شعبہ: اس امر کا اہتمام کہ مسلم ممالک کا نظام تعلیم مغرب کے نظام تعلیم کے مطابق ہو۔ اس غرض سے مسلمان ملکوں کو تعلیمی بہتری کے نام پر بڑی بڑی رقوم بطور امداد وقرض دینا۔ اسلامی تربیت کو ختم کرنا۔ مخلوط تعلیم کو رواج دلانا تاکہ مسلمان نوجوانوں کے اخلاق بگڑیں۔ تعلیم کو مال تجارت بنا دینا اور مہنگا کرا دینا تاکہ مسلمان جاہل رہیں اور مسلم معاشرے میں شرح تعلیم کم رہے۔ تعلیم کو انگریزی میڈیم بنا دینا اور انگریزی کو پہلی جماعت سے لازمی مضمون بنا دینا، مغربی یونیورسٹیوں کا نظام امتحان وہاں رائج کرا دینا۔ ان

اقدامات سے مقصود یہ ہے کہ مسلم ممالک میں تعلیم کم ہو جائے اور نوجوان نسل کو مغرب کا فکری اور عملی غلام بنادیا جائے۔

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ یہ دیگ کے چند چاول ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پوری دیگ ہی ایسی ہے۔

٦۔ اور جہاں پر امن طریقے اور سازشیں ناکام ہو جائیں وہاں مغرب اپنی بھاری بھر اور جدید ترین مہیب حربی قوت کو حرکت میں لاکر مسلمان ممالک کو تباہ کرڈالتا ہے اور وہاں اپنی ناپسندیدہ حکومت کو ختم کر کے اپنی گماشتہ حکومتیں قائم کر دیتا ہے جو اپنے ہاں مغربی اصول و اقدار کو نافذ کرنے سے نہ ہچکچائیں جیسا کہ افغانستان، عراق اور کئی دوسرے مسلم ممالک میں ہو رہا ہے۔

ان دلائل سے واضح ہے کہ نہ صرف قرآن وسنت کی مقدس نصوص کی رو سے یہود ونصاریٰ، جو مغربی تہذیب کے علمبردار ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں بلکہ ان کا رویہ عملاً بھی اسلام اور مسلم دشمنی کا ہے جس کے ہم سب عینی شاہد ہیں۔

پانچویں دلیل

مسلمانوں کو اسلام سے دُور کرنا

مسلمانوں کو زوال پذیر رکھنے اور اُن پر اپنے نظریات اور بالادستی مسلط رکھنے کے لیے اہل مغرب کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر ایسا طریقہ استعمال کریں جس سے مسلمان دین سے دُور ہو جائیں اور دینی تعلیمات پر عمل نہ کریں یا بعض چیزوں میں دین پر عمل کو ضروری نہ سمجھیں۔ اس کے لیے وہ بہت سے طریقے، اسالیب اور ٹیکنیکس استعمال کرتے ہیں مثلاً دینی مدارس کی حوصلہ شکنی کرنا، جدید تعلیم کو مال تجارت بنادینا، اسے مغرب زدہ بنادینا، مخلوط تعلیم کو رواج دینا، پری سکول کی تعلیم کو رواج دینا، تعلیمی اداروں میں کنسرٹس، فیشن شوز، میوزک کلاسز، مخلوط پکنک وغیرہ کو معمول بنادینا۔

میڈیا کے ذریعہ فحاشی عریانی، زنا کاری، اور زر پرستی کو رواج دینا، صحافیوں کے ساتھ ساتھ اینکر پرسنز، ادیبوں، شاعروں، افسانہ وناول نگاروں اور ڈرامہ نویسوں کو بھی مغربی افکار وتصورات کا اسیر رکھنا تا کہ وہ اسلامی فکر وادب کے لیے کام نہ کر سکیں۔ نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنا، خاندانی نظام کو تباہ کرنا اور خاندانی نظام کو تباہ کرنے کے لیے محبت کی شادیوں اور لڑکیوں کے گھر سے فرار کی حمایت کرنا، طلاقوں کی کثرت، بزرگوں اور ماں باپ کے ادب و احترام میں کمی، اولڈ ایج ہوم بنانا اور انٹرنیٹ اور موبائل میں مصروف رہ کر دینی فرائض کو وقت نہ دینا وغیرہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

مغربی معاشرے کی طرح مسلم لڑکیوں کو دکانوں میں سیلز گرلز لگوانا، دفتروں میں سیکرٹری اور ریسپشنٹ (استقبالیہ کلرک) لگوانا، انہیں ائیر ہوسٹس اور بس ہوسٹس بنانا۔

تزکیۂ نفس کے جامع تصور کو سامنے نہ آنے دینا، اسے تصوف تک محدود رکھنا اور تصوف کے مفید اور تعمیری پہلوؤں کو چھوڑ کر اس کے بارے میں یہ تاثر دینا کہ یہ اسلام کی بجائے ''انسانیت'' کا علم بردار ہے۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کو بھی نجات کے لیے کافی قرار دینا، تصوف میں غیر اسلامی رسوم ورواج کی حوصلہ افزائی اور پشت پناہی کرنا۔

مسلم معاشرت میں غیر اسلامی رسوم ورواج کو فروغ دینا مثلاً عورتوں کو بے پردگی اور غیر ساتر لباس کی ترغیب دینا، شادیوں میں ہندوانہ رسوم اور اسراف نیز ولینٹائن ڈے کو مروج کرانا۔ عورت اور مرد کے مساوات کے نعرے کو مقبول کرانا، عورتوں میں ملازمت کی حوصلہ افزائی کرنا، انہیں لوکل باڈیز اور اسمبلیوں میں زیادہ نشستیں دلانے کی کوشش کرنا تا کہ عورت گھر سے نکلے، اس کے اخلاق بگڑنے کا امکان بڑھے اور وہ گھر میں بچوں کی تربیت نہ کر سکے۔

دینی جماعتوں کو آپس میں لڑانا، فرقہ واریت اور مسلک پرستی کو فروغ دینا، دینی مدارس کو عصری تدریس کی طرف نہ آنے دینا، دینی سیاسی جماعتوں کو آپس میں لڑا کر اور سیکولر جماعتوں سے ہروا کر دین کی ہوا خیزی کرنا، علماء کرام کی اخلاقی کمزوریوں کو اچھالنا اور انہیں

دنیاوی کاموں کے لیے نااہل ثابت کرنا۔ متجددین کی حوصلہ افزائی کرنا تاکہ وہ اسلام کا ایسا ایڈیشن سامنے لاسکیں جو مغربی اصول واقدار کے مطابق ہو۔ دینی جماعتوں کے پروگراموں کو مؤثر نہ ہونے دینا۔

حیلوں بہانوں سے سود کو مسلم معیشت میں جاری رکھنا اور اس کو ختم نہ ہونے دینا، انڈسٹریلائیزیشن کے ذریعے سے بیروزگاری میں اضافہ کرنا، بین الاقوامی اداروں سے قرض دلوا کر ملکی معیشت کو تباہ کرنا، انہیں ڈالر سے وابستہ رکھنا، اہل مغرب سے ہتھیاروں کی خریداری پر کروڑوں اربوں روپے خرچ کرانا۔ مغرب سے ہیوی مشینری اور تعیّشات کی درآمد، برآمدات کم رکھنا، بینکوں کے سودی نظام کو حیلے بہانوں سے جاری رکھنا اور مغربی طرز کی بنکنگ میں برائے نام تبدیلیوں سے (جن سے سود کی روح برقرار رہتی ہے، صرف شکل بدل جاتی ہے) انہیں اسلامی بنکنگ قرار دینا۔ مسلم ممالک کے حکمرانوں کو اللوں تللوں کی ترغیب دینا، انہیں کمیشن اور کِک بیکس (Kick backs) سے جمع کردہ دولت کو مغرب کے بینکوں میں جمع کرانے کا موقع دینا تاکہ ملکی معیشت کا ستیاناس ہوجائے۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ٹرینڈ ماہرین اقتصادیات کو خزانہ اور تجارت کے وزیر بنوانا تاکہ وہ مغربی ممالک کے مفادات کے تحفظ کے لیے مالیاتی اور تجارتی پالیسیاں بناسکیں۔

اہل مغرب کا مقصد ان سب اقدامات سے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام سے دور کیا جائے اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ اسلام کے اصول واقدار پر عمل نہ ہوسکے۔

چھٹی دلیل

مغربی فکر وتہذیب مسلم زوال کا سبب ہے

مسلم زوال کے اسباب کے دو بڑے دائرے ہیں۔ ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی دائرے سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب خود مسلمان اور ان کی خامیاں اور کمزوریاں ہیں۔ اور خارجی دائرے سے مراد یہ ہے کہ باہر کی قوتیں اور ادارے مسلم

زوال کے لیے کوشاں اور سرگرم ہیں۔

بلاشبہ داخلی دائرے کو ترجیح حاصل ہے اور وہ اہم تر ہے اور اس کتاب میں ہم اسی پر سوچ بچار کر رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خارجی دائرہ غیر اہم ہے بلکہ یہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اس دائرے نے اتنی وسعت اختیار کر لی ہے کہ یہ داخلی دائرے کو بھی متاثر کر رہا ہے، تو اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

اس دلیل کا مقدمہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی داخلی خرابیاں اور کمزوریاں تو ان کی شکست اور زوال کا سبب ہیں ہی لیکن کچھ بیرونی قوتیں بھی ایسی ہیں جو آج سے نہیں آغاز اسلام ہی سے اسلام اور مسلمانوں کی مخالف اور دشمن ہیں۔ انہیں دین سے دور کرنا چاہتی ہیں اور ان کے زوال کی خواہاں ہیں۔

قرآن وسنت نے کفار یعنی اسلام کا انکار اور بطلان کرنے والوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا ہے: ۱۔ مشرکین۔ ۲۔ یہود اور ۳۔ نصاریٰ۔ مغربی فکر وتہذیب کے علم بردار ممالک میں (جن میں یورپ، امریکہ، آسٹریلیا اور ان کے حلیف اسرائیل اور بھارت وغیرہ شامل ہیں) یہ تینوں گروہ (مشرکین، یہود اور نصاریٰ) شامل ہیں بلکہ ان یہود ونصاریٰ میں اب اہل کتاب ہونے کی صفت تقریباً ختم ہو گئی ہے (جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے) اور ان سب کا شمار اب محض کفار میں ہوتا ہے بلکہ انہیں 'الکفر ملة واحدة' شمار کرنا چاہیے۔

یہودی تو عہد رسالت مآب ﷺ میں اسلام اور مسلم دشمنی کا علانیہ مظاہرہ کرتے رہے لیکن عیسائی چونکہ جزیرہ العرب میں صرف نجران کے علاقے ہی میں محدود تھے اور کمزور تھے اس لیے انہوں نے خاموشی سے اسلام کی بالادستی قبول کر لی۔ لیکن عہد صحابہ میں جب مسلمانوں نے اپنے دفاع کو مضبوط کرنے کے لیے اور نصرت اسلام کے لیے رومی علاقے فتح کر لیے تو رومی بادشاہ فرار ہو کر قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ دسویں صدی میں عیسائیوں نے متحد ہو کر خصوصاً بیت المقدس کو واپس لینے کے لیے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز

کیا۔ پھر چودھویں صدی میں یہودیوں نے مسلمانوں کے اندلس سے خاتمے اور در بدری میں وہاں کے عیسائی حکمران کا ساتھ دیا۔ 1453ء میں جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرلیا اور کیتھولک ہیڈ کوارٹر فتح کرلیا تو عیسائی پادری یورپ میں پھیل گئے اور انہوں نے وہاں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصب کا زہر خوب پھیلایا۔ اگلی چند صدیوں میں جب مسلمان اپنی داخلی کمزوریوں کے سبب زوال پذیر ہوئے تو یورپ کی ابھرتی ہوئی قوتوں نے مسلمانوں کو پوری طرح مغلوب کرنے کے لیے ان کے خلاف شازشیں شروع کردیں جس کا ایک محور عربوں کو ترکوں سے لڑانا تھا اور جب پہلی جنگ عظیم میں ترک خلافت کو شکست ہوئی تو مغربی عیسائی قوتوں نے نہ صرف مغربی ممالک کے یہودیوں کو ساتھ ملا کر مسلم ممالک کو غلام بنالیا اور کمزور کرنے کے لیے انہیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کردیا بلکہ یہودیوں کو فلسطین میں مستقل ٹھکانہ فراہم کرنے کی راہ بھی ہموار کی۔ تب سے یہودی اور عیسائی مل کر مسلمانوں کے خلاف پر امن سازشوں کے ذریعے اور حسب ضرورت ننگی جارحیت کے ذریعے انہیں غلام بنائے رکھنے اور زوال سے نکلنے نہ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلمان اگرچہ اپنی داخلی کمزوریوں کی وجہ سے زوال پذیر ہوئے لیکن ان کی گرتی ہوئی دیوار کو دھکا دینے کے لیے اور اُن کے گھر پر قابض ہونے میں مغربی فکر تہذیب کے علم بردار ممالک نے سستی سے کام نہیں لیا بلکہ اس موقع سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور صدیوں سے چلتی آرہی ناکامیوں اور نفرتوں کی وجہ سے ان سے بھرپور انتقام لیا اور انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اسلام اور مسلمانوں سے نفرت اور بغض کا کیا عالم تھا اُس کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں جب فرانسیسی فوجیں دمشق میں داخل ہوئیں تو فرانسیسی کمانڈر سلطان صلاح الدین کی قبر پر گیا اور اسے ٹھڈا مارتے ہوئے کہا: ''اٹھو صلاح الدین! ہم آ گئے ہیں''۔

ساتویں دلیل

مغربی تہذیب مسلمانوں کے زوال کے تسلسل میں بنیادی کردار ادا کر رہی ہے

ماضی میں اسلام اور مسلمانوں کو دو بڑے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ اِن میں پہلا حملہ یونانی فکر و تہذیب نے کیا لیکن چونکہ یہ حملہ فکری تھا اور پھر اس کے پیچھے کوئی زندہ تہذیب اور سیاسی قوت نہ تھی اس لیے مسلمان اس سے کچھ فکری نقصان اٹھانے کے باوجود اسے پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلم تہذیب پر دوسرا حملہ منگولوں نے کیا اور اگرچہ وہ مسلم مملکت کے بڑے حصے کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن منگولوں کی یہ کامیابی محض اُن کی جنگی قوت کی وجہ سے تھی اور اُس کی پشت پر کوئی علمی اور فکری قوت نہ تھی اس لیے اس جنگ میں عارضی شکست کے بعد مسلمان انہیں علمی اور فکری لحاظ سے مغلوب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

لیکن انیسویں اور بیسویں صدی میں متحدہ یورپ کا مسلمانوں پر حملہ نہ صرف حربی تفوق کی بنیاد پر تھا بلکہ اُس کی پشت پر ایک طاقت ور علمی اور فکری تحریک بھی تھی۔ چنانچہ اہل مغرب نے صرف مسلم علاقے فتح کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ انہیں مستقل اپنا غلام رکھنے کے لیے اُن کے دل و دماغ کو بھی فتح کرنے کی کامیاب منصوبہ بندی کی۔ چنانچہ ہندوستان میں دیکھیے کہ انگریزوں نے جب ہندوستان پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا تو اُنہوں نے مسلمانوں کا دین بدلنے کے لیے عیسائی پادریوں کی بڑی کھیپ کے ذریعے مسلمانوں کا دین بدلنے کی کوشش کی لیکن جب اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی تو اُنہوں نے اس کے متبادل پر غور کیا اور تعلیم و تربیت کو اس کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ ۱۸۳۲ء میں لارڈ میکالے نے اپنی وہ مشہورِ زمانہ تعلیمی رپورٹ تحریر کی جس میں اُس نے کہا کہ ہمیں تعلیم کے ذریعے اپنی رعایا کو اپنی فکر و تہذیب کا خوگر بنانا ہے تاکہ اگر وہ اپنا مذہب نہ بھی بدلیں تو ہماری فکر و تہذیب ہی کو زندگی کی معراج سمجھیں اور اس کے مطابق ہی زندگی گزارنے کی تمنا پالیں۔ چنانچہ انگریز نے مسلم اوقاف ختم کر کے اور انگریزی کو قومی زبان قرار دے کر مسلم تعلیمی نظام ختم کر دیا اور اس کی

جگہ اپنا نظام تعلیم رائج کر دیا۔ یہی کام انہوں نے اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی کیا اور اس طرح مسلمانوں کا سیاسی، معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ منہدم کر کے نیا اجتماعی ڈھانچہ قائم کیا جو اسلام کی بجائے مغربی فکر و تہذیب پر مبنی تھا۔ اپنی اس حکمت علمی کے ذریعہ انگریز مسلم سیاست دانوں، بیوروکریسی، معلموں، شاعروں اور ادیبوں کی صورت میں ایسے بڑے طبقات کھڑے کرنے میں کامیاب ہو گیا جن کے نام اگرچہ مسلمانوں جیسے تھے لیکن وہ مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب و متاثر تھے اور اُسے ہی دنیا میں حصول ترقی اور حصولِ عظمت کا زینہ سمجھتے تھے۔

چنانچہ جب دوسری جنگ عظیم میں اہل مغرب آپس کی لڑائیوں کی وجہ سے کمزور ہوئے تو وہ مسلم ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہوئے لیکن اس کے باوجود انہوں نے کوشش کی کہ نوازائیدہ مسلم ممالک میں وہ اقتدار اپنی ہم نوا قوتوں کو سونپ کر جائیں جو معاشرے میں مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب عناصر کی مدد سے مغربی مقاصد اور اہداف کے مطابق حکومت چلائیں۔ انہیں اس میں کامیابی ہوئی اور آج بھی اکثر مسلم حکمران برائے نام مسلمان ہونے کی وجہ سے اور مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب ہونے کے باوجود آج بھی مغربی پالیسیوں کے مطابق اور ان کے اہداف کے لیے ان کے گماشتے کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک میں پالیسیاں آج بھی اہل مغرب کی چل رہی ہیں۔ ان کا تعلیمی نظام مغرب سے ماخوذ ہے، اُن کا سیاسی نظام مغربی جمہوریت سے مستنبط ہے، ان کا معاشی نظام مغرب کے سرمایہ دار نظام پر مبنی ہے۔ ان کا قانونی نظام شریعت کی بجائے مغربی دساتیر کی نقالی پر مبنی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اور مغرب کی ساری کوششوں کے باوجود اگر کوئی مسلم ملک اٹھا کر چلتا ہے یا اپنی مرضی کرنا چاہتا ہے تو اُنہیں آپس میں لڑا کر ختم کر دیا جاتا ہے یا پرامن سازشوں سے اُنہیں ناکام بنا دیا جاتا ہے۔ اور اگر پھر بھی کوئی سخت جان نکلے تو اہل مغرب متحد ہو کر اپنی جدید ترین اور بھاری بھر کم مشینری سے اسے کچل دیتے ہیں جیسا کہ انہوں نے عراق، افغانستان اور لیبیا

میں کیا۔ شام اور یمن میں بربادی کا یہ تماشا جاری ہے اور پاکستان وایران اور دوسرے کئی ممالک کے اردگرد یہ شکنجہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ امریکہ ویورپ کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی ہے کہ مسلمانوں کو مغلوب رکھا جائے اور اسلام کو مغربی فکر وتہذیب کے مقابلے میں ایک فکری اور تہذیبی قوت کے طور پر سامنے نہ آنے دیا جائے۔ اسی وجہ سے مسلمان مغرب کی فکری غلامی کے شکنجہ سے نکل نہیں پا رہے اور جہاں کوئی نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا سر کچل کر اُسے سبق سکھایا جاتا ہے کہ دوبارہ سر نہ اٹھانا۔ اس طرح مغرب اپنی اس حکمت عملی میں کامیاب ہے کہ مسلم ہمیشہ زوال پذیر ہی رہیں اور زوال کے گڑھے سے نہ نکل سکیں۔

آٹھویں دلیل

مغربی تہذیب مسلمانوں کے زوال سے نکلنے اور ان کی ترقی واستحکام میں مزاحم ہے

مسلم زوال میں مغرب کے کردار کے حوالے سے تین پہلوؤں پر گفتگو کی جاسکتی ہے:

ایک: یہ کہ مسلمانوں کے زوال پذیر ہونے میں مغربی فکر وتہذیب کا ایک کردار ہے۔

دوسرے: یہ کہ مغرب اس زوال کے استمرار اور مسلمانوں کی ترقی واستحکام کی راہ کھوٹی کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

تیسرے: یہ کہ مغرب ہمارے اس زوال سے نکلنے میں مزاحم ہے۔

یہ تینوں باتیں ہم نے اس لیے اکٹھی لکھی ہیں تاکہ قاری ان میں فرق ملحوظ رکھ سکے۔ پہلے دو نکات پر ہم گفتگو کر چکے ہیں، اس وقت تیسرے نکتے پر بات ہو رہی ہے کہ مغرب نہیں چاہتا کہ ہم زوال کی اس دلدل سے نکلیں اور وہ باقاعدہ پلاننگ سے ہماری ترقی و استحکام کے راستے میں مزاحم ہے۔ اب ہم اس امر پر غور کریں گے کہ اس کے لیے مغرب کی حکمت عملی کیا ہے؟ بلکہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم زندگی کے چند بڑے شعبوں کا ذکر کر کے دیکھیں کہ مغرب مسلمانوں اور عالم اسلام کے حوالے سے وہاں کیا پالیسیاں اپنائے ہوئے

ہے؟ یہ بھی یاد رہے کہ ہم یہاں مغرب کی مذکورہ حکمت عملی اور پالیسی کی طرف محض اشارات پر اکتفا کریں گے کیونکہ اگر ہم نے ہر نکتے کی تفصیل اور ثبوت دینا شروع کیے تو یہ بذاتہ ایک ضخیم تحقیقی دستاویز بن جائے گی جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

سیاسی شعبہ

اہل مغرب کی کوشش ہے کہ مسلم ممالک آپس میں موثر طور پر متحد نہ ہوں، ان کے ہاں سیاسی استحکام نہ آئے اور صحیح معنوں میں جمہوری حکومتیں قائم نہ ہوں۔ اس کے لیے وہ جمہوریت کی بجائے بادشاہوں (سعودی عرب، مراکش، اردن، امارات، قطر بحرین، کویت وغیرہ) کی حمایت کرتا ہے اکثر مسلم ممالک میں اسلامی جمہوری سیاسی قوتوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اگر کہیں ہو جائیں تو وہاں فوج کو ان سے لڑا دیتا ہے اور فوجی آپریشن شروع کرا دیتا ہے جیسے الجزائر، مصر اور فلسطین میں ہو چکا۔ مسلم ممالک کو وہ آپس میں موثر اتحاد نہیں کرنے دیتا (اس کے لیے وہ او آئی سی (OIC)، موتمر عالم اسلامی اور رابطہ عالم اسلامی کو فعال نہیں ہونے دیتا۔ اور سلامتی کونسل میں پونے دو ارب مسلمانوں کو نمائندگی نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس مسلم ممالک کو آپس میں لڑاتا ہے۔ جیسے ماضی میں اس نے ایران اور عراق کو لڑایا، عراق اور کویت کو لڑایا، سعودی عرب اور یمن کو لڑایا۔ اس وقت بھی وہ ایران کو شرق اوسط کے مسلم ممالک سے لڑا رہا ہے، شام اور یمن میں شیعہ اور سنی کو لڑا رہا ہے۔ افغانستان اور پاکستان کو لڑا رہا ہے۔ مسلمان ممالک میں خانہ جنگی کراتا ہے خصوصاً وہاں عیسائی اقلیت کو مسلح اور منظم کر کے جیسے انڈونیشیا، سوڈان، اور نائیجیریا میں ہو چکا۔ وہ اسلامی جنگجو گروپوں کو منظم کر کے اور اسلحہ و تربیت دے کر انہیں مسلمان حکومتوں سے لڑاتا ہے جیسے داعش کو عراق سے، کردوں کو ترکی سے اور تحریک طالبان پاکستان کو پاکستان سے۔

عسکری شعبہ

وہ کسی مسلمان ملک کو بڑی فوج نہیں رکھنے دیتا، انہیں عسکری طور پر خود کفیل نہیں ہونے دیتا، وہاں جدید اسلحے کے کارخانے نہیں لگنے دیتا۔ مسلم ممالک کو فوجی طور پر متحد نہیں ہونے

دیتا۔فوجی طور پر مستحکم ہونے کی کوشش کرنے والے ممالک پر حملہ کر کے انہیں تباہ کر دیتا ہے جیسے عراق، لیبیا اور شام کے ساتھ کیا گیا۔ وہ کسی مسلم ملک کو ایٹمی قوت نہیں بننے دیتا جیسا کہ لیبیا، شام، عراق اور ایران کے ساتھ ہو چکا اور پاکستان نے مغرب کی مرضی کے خلاف ایٹمی صلاحیت حاصل کر لی تو اس پر معاشی پابندیاں لگیں اور اسے ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنے کے لیے سازشیں اور ریشہ دوانیاں آج بھی عروج پر ہیں۔

معاشی شعبہ

مسلم ممالک کو سودی قرضوں میں جکڑنا، انہیں خود کفیل نہ ہونے دینا۔ ان کے ہاں ہیوی اور جدید انڈسٹری نہ لگنے دینا۔ ان کی آبادی نہ بڑھنے دینا۔ وہاں شرح تعلیم کم رکھنا۔ غیر سودی معیشت کو نہ پنپنے دینا۔ مسلم ممالک کی اپنی ایک کرنسی نہ بننے دینا۔ ان میں باہم تجارت کو فروغ نہ ہونے دینا۔ مسلم ممالک کی برآمدات کم رکھنا اور درآمدات کو بڑھانا تاکہ مسلمان معاشی طور پر زبوں حال رہیں۔

تعلیمی شعبہ

مسلم ممالک میں تعلیم کو اسلامی بنیادوں پر منظم نہ ہونے دینا۔ وہاں شرح تعلیم اور معیار تعلیم نہ بڑھنے دینا۔ مسلم ممالک میں نظام تعلیم کو مغربی فکر وتہذیب کے اصولوں پر استوار کرنا مثلاً مخلوط تعلیم کو عام کرنا، رٹے کو رواج کر دینا۔ تعلیم کو مال تجارت بنا دینا۔ نصاب اور نصابی کتب مغرب سے درآمد کرنا۔ مغربی ممالک کے امتحانات دلوانا (جیسے او، اے لیول)، انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا۔ دینی تعلیم کی اور دینی تعلیم کے اداروں (دینی مدارس) کی حوصلہ شکنی کرنا.....وغیرہ۔

یہ محض مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ ایک ایک شعبے کی تفصیل دے کر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مغربی ممالک پوری کوشش کر رہے ہیں کہ مسلم ممالک مغربی فکر وتہذیب کو اپنا لیں۔ ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم کو اختیار کر لیں اور اسلام کو نماز روزے تک محدود

رکھیں۔ بدقسمتی سے اکثر مسلمان ممالک کے حکمران مغرب کے ان مقاصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔

نویں دلیل

احساس زیاں کا خاتمہ اور بے حسی

ظلم کی بدترین شکل یہ ہے کہ ظالم مارے اور رونے بھی نہ دے۔ اس کی دو شکلیں ہیں: ایک تو یہ کہ ظالم کا ظلم اور دباؤ اتنا شدید ہو کہ وہ ظلم کرے لیکن مظلوم کو چیخنے چلانے نہ دے، فریاد بھی نہ کرنے دے کہ مجھ پر ظلم نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ وہ ابلیسانہ مکاری سے ایسے حالات پیدا کر دے کہ مظلوم اس ظلم کو ظلم ہی نہ سمجھے بلکہ اسے مہربانی کی ایک شکل سمجھے۔ اس کا زیاں ہو رہا ہو لیکن وہ اسے زیاں نہ سمجھے اور یوں اس کے احساس زیاں کا خاتمہ ہو جائے اور وہ حسّیں رکھنے کے باوجود بے حس ہو جائے یعنی ظالم اسے بے حس بنا دے اور ظلم کے خلاف اس کی حساسیت (Sensitivity) ختم کر دے۔

مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مذکورہ دونوں طرح کی حکمت عملی اپنائی ہے۔ ہمارے دیکھتے اس نے عراق، افغانستان اور لیبیا کو اپنی مہیب اور جدید ترین جنگی مشینری سے تباہ کیا ہے اور 57 مسلم ممالک کو چوں نہیں کرنے دی۔ تاہم اس کا زیادہ زور مکارانہ ابلیسی پالیسی پر رہا ہے کہ اس کا ظلم ظلم لگے ہی نہیں بلکہ مہربانی لگے۔ اس کی چند اہم صورتیں درج ذیل ہیں:

ا۔ متبادل نظام دینا

اہل مغرب نے مسلمان ممالک پر قبضہ کرنے کے بعد ان کا اجتماعی ڈھانچہ (سیاسی نظام، معاشی نظام، تعلیمی نظام۔۔۔) وغیرہ زمین بوس کر دیا اور اپنی فکری اور تہذیبی بنیادوں پر اس کی تعمیر نو کی اور اسے جدید ترین، بہترین، مفید، تعمیری اور کارآمد قرار دیا۔ جو نسل اس سے متاثر ہوئی تھی وہ تو روتی پیٹتی رہی لیکن بعد کی نسلوں نے اس جمے جمائے نظام کو عملاً مفید

طریقے سے کام کرتے دیکھا تو وہ اس سے مانوس ہوتی چلی گئیں اور انہوں نے اسے قبول کرلیا۔ ہم نے پاکستان میں بدانتظامی اور ناانصافی کا بازار گرم دیکھ کر کئی بزرگوں کو اپنے کانوں سے کہتے سنا ہے کہ اس سے تو انگریزوں کا نظام بہتر تھا یا یہ کہ ہمارے حکمرانوں کو چاہیے کہ ملک چلانے کے لیے وہ اسے انگریزوں کو ٹھیکے پر دے دیں۔

۲۔ استعمار نے نظام کفر کے خلاف مسلمانوں کی مزاحمت کو ان کے اندر سے توڑا

ا۔ اس کی کئی مثالیں ہیں مثلاً: استعمار نے برصغیر میں مسلمانوں کا نظام تعلیم ختم کیا اور اسے نئی بنیادوں پر استوار کیا۔ پھر اس نے سرسید جیسے اپنے ہم خیالوں اور ہمدردوں کو آگے کیا جنہوں نے یہ کہہ کر علی گڑھ جیسے نئے تعلیمی ادارے قائم کیے کہ ہمارا نظام تعلیم فرسودہ ہو چکا ہے، اب جدید یورپی طرز کے تعلیمی اداروں کا قیام ناگزیر ہے۔

۲۔ انگریز نے مسلمانوں کی بغاوت کو فوج اور اسلحے کے زور سے کچلا پھر مسلمانوں میں سے روح جہاد ختم کرنے کے لیے اس نے ان کے اندر سے نیا نبی کھڑا کیا (غلام احمد قادیانی) جس نے جہاد کے خاتمے کا اعلان کیا اور انگریز کی بالادستی قبول کرنے کو عین شرعی قرار دیا۔

۳۔ اس نے برصغیر میں متجددین کا ایک پورا طبقہ ابھارا یعنی ایسے اسلامی سکالرز کو فروغ دیا جو مغرب کی فکری بالادستی کو قبول کرتے تھے اور اسلام کی ایسی تشریح کرتے تھے جو مغربی فکر وتہذیب کے مطابق ہو۔ سرسید، امیر علی، چکڑالوی، امرتسری، غلام احمد پرویز، غلام جیلانی برق اور ہمارے عہد میں مولانا وحید الدین خان اور جاوید احمد غامدی اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

۴۔ کافر استعمار کے استیلاء، غلبے اور مظالم کے ردعمل میں مسلمانوں میں تین نقطہ ہائے نظر کی حامل تحریکیں اور جماعتیں ابھریں جو غیر متوازن تھیں، جادہ اعتدال سے ہٹی ہوئی تھیں اور جن کو مغربی استعمار نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔

ایک: وہ جماعتیں جنہوں نے دین کے سیاسی غلبے کو پورا اسلام قرار دے دیا جیسے جماعت اسلامی، اخوان المسلمون، حزب التحریر وغیرہ۔ دوسرے: وہ اصلاحی اور تبلیغی جماعتیں اور تعلیمی ادارے جنہوں نے دین کو اصلاح اور تعلیم وتزکیے (کے محدود ویژن) تک محدود کر دیا اور دین کے سیاسی اور تہذیبی غلبے سے صَرف نظر کر گئیں جیسے تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی، دینی مدارس اور صوفیاء کے حلقے۔ تیسرے: پر جوش مسلمانوں کی وہ تحریکیں جنہوں نے مغربی استعمار کا مقابلہ میدان جنگ میں کرنے کی کوشش کی اور انتقامی جذبے کا شکار ہو کر غیر متوازن ہو گئیں اور ان کے بعض عناصر مغربی استعمار کی خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے جیسے تحریک طالبان پاکستان، القاعدہ اور داعش وغیرہ۔

۳۔مغرب نے غلبۂ دین کی خواہاں قوتوں کو ناکام بنایا

اس کے لیے اس نے عموماً پر امن ذرائع استعمال کیے جیسے خفیہ سازشوں سے روایتی اور سادہ لوح دینی عناصر کو غلبۂ دین کی خواہاں جماعتوں سے لڑایا، حکمرانوں کو قابو کیا اور ان کے ذریعے غلبہ دین کی خواہاں قوتوں کو دبایا اور ہرایا۔ اسلام کا سیاسی نظام نہ ابھرنے دیا۔ اپنی جمہوریت کو مسلم ملکوں میں مروج کیا، نظام انتخابات میں خرابیاں پیدا کیں اور دینی سیاسی جماعتوں کو کامیاب نہ ہونے دیا اور اگر کہیں وہ ان ساری رکاوٹوں کے باوجود جیت گئیں تو انہیں اقتدار منتقل نہ ہونے دیا۔ ان کی حکومتیں بن گئیں تو وہاں کی فوج اور عدلیہ کو ان سے لڑا دیا اور انہیں ناکام بنا دیا۔ ہمارے دیکھتے یہ سب کچھ الجزائر، فلسطین اور مصر میں ہو چکا ہے اور پاکستان، انڈونیشیا، ملائیشیا، سوڈان، لیبیا، شام اور دوسرے بہت سے مسلم ملکوں میں پر امن سازشوں سے دینی سیاسی جماعتوں کو اقتدار سے باہر رکھا گیا۔

۴۔اہل مغرب نے دینی قوتوں کو ریڈیکیول (Ridicule) کیا

مسلمان حکمرانوں کو اپنا ایجنٹ بنا کر اور ان کے ذریعے ریاستی قوت کو حرکت میں لا کر غلبہ دین کی علم بردار سیاسی قوتوں کے نظریات کو مغرب نے ''پولیٹیکل اسلام'' قرار دے

دیا۔ کفار کی فکری مزاحمت کو انتہا پسندی اور مسلح مزاحمت کو دہشتگردی کہا جانے لگا۔ قرآن کو دہشت گردی کا علم بردار کہہ کر جلایا گیا۔ جعلی قرآن شائع کیا گیا۔ یہی الزامات لگا کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاٹون بنائے اور چھاپے گئے اور اسے حقِ آزادی اظہار قرار دے کر اس کی حمایت کی گئی۔

۵۔ عام مسلمانوں کو دین سے دور کیا

مغرب نے پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعے، ادب اور لٹریچر کے ذریعے، فکر و فلسفہ کی تحریکوں کے ذریعے نیز سیاسی، حربی، تہذیبی اور ثقافتی دباؤ کو کام میں لا کر یعنی گلوبلائزیشن اور نیو ورلڈ آرڈر، جمہوریت اور نیشنلزم، سرمایہ دارانہ نظام، سود اور قرض کی معیشت، بینکنگ، انڈسٹریلائیزیشن، مغرب زدہ اور مخلوط تعلیم کے ذریعے، ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذریعے مسلمانوں کو طنز واستہزاء اور دجل وفریب کا نشانہ بنایا۔ اس امر کی بھرپور کوشش کی گئی (اور یہ بڑی حد تک کامیاب رہی) کہ مسلمان اپنے دین سے دور ہو جائیں، اپنے نظریۂ حیات سے دور ہو جائیں، مغربی اقدار کو اپنا لیں، اور دینی قوتیں برسر اقتدار نہ آسکیں۔

حاصلِ بحث

قارئین کرام!

یہ ہیں وہ نقلی وعقلی دلائل جن کی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ مغربی فکر و تہذیب کا رد شرعاً واجب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلم مفکرین، مصلحین، علماء، فقہاء، اسلامی سکالرز، اہل دانش کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف خود مغربی فکر و تہذیب کو اپنی فکر میں، اپنی تحریروں میں، اپنی تقریروں میں رد کریں بلکہ مغربی فکر و تہذیب کو رد کرنے کے علم بردار اور داعی بن کر کھڑے ہو جائیں اور عامۃ الناس، پڑھے لکھے لوگوں اور معاشرے کے مقتدر طبقات پر واضح کریں، انہیں اس کی تعلیم دیں، اس کے لیے دلائل دیں، انہیں اس پر مطمئن کریں کہ ہمیں مغربی فکر و تہذیب کو رد کر دینا چاہیے کیونکہ عصر حاضر میں اور موجود حالات میں قرآن و

سنت پر عمل، دینی اصول و اقدار پر عمل، انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل، اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم مغربی فکر وتہذیب کو رد نہ کریں، اس تہذیب کو جو دراصل وضعی دین ہے، جو غیرِ اسلام ہے، جو ماسوا اسلام دین ہے، جو اسلام سے مختلف ہی نہیں اس سے متضاد ہے اور متضاد ہی نہیں اسلام اور مسلم دشمن ہے، جو ہمیں دین سے دور کرنے پر مصر ہے، جو ہمیں اپنے الحادی رنگ میں رنگنے پر تلی ہوئی ہے۔ جب تک ہم اسے رد نہ کریں ہم دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے، ہم اپنی آخرت نہیں سنوار سکتے اور ہم عملاً اچھے مسلمان اور اچھے انسان نہیں بن سکتے۔

لہٰذا مسلم اہل علم وفضل کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ مغربی فکر وتہذیب کو رد کر دیں، اسے سمجھ کر شعوری طور پر رد کریں اور پھر اپنا فہم مسلم عوام تک پہنچائیں، عام مسلمانوں کو سمجھائیں، خواص خصوصاً حکمرانوں کو، حکمران طبقوں کو، خوشحال اور کھاتے پیتے لوگوں کو، پڑھے لکھے لوگوں کو، سیاست دانوں کو، سرمایہ داروں کو، جاگیرداروں کو، فوجی افسروں کو، ججوں اور وکیلوں کو، پروفیسروں، ڈاکٹروں، انجینئروں کو سب کو اس شیطانی اور دجالی تہذیب سے بچائیں۔ علماء اور صلحاء مسلم عوام وخواص کو اس ابلیسی تہذیب سے بچانے کی دوا کریں اور دوا کے ساتھ ساتھ اللہ تعالی سے دعا بھی کریں کہ وہ مسلمانوں کو اس شیطانی اور دجالی تہذیب کے شر سے بچائیں، ان کو ایمان والا بنائیں، دین والا بنائیں، ان کو اخلاق والا بنائیں، ان کو اسلام پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور اس ملحدانہ تہذیب کی چکاچوند سے اور اس کے دجل وفریب سے انہیں محفوظ رکھیں اور انہیں اسلام کی حیات بخش تعلیمات پر عمل کی توفیق سے نوازیں۔ آمین، یارب العالمین۔

باب دوم

ردّ مغربی فکر و تہذیب کے ہمارے مؤقف پر اعتراضات و اشکالات کا جائزہ

ردّ مغربی فکر و تہذیب کے ہمارے موقف پر
اعتراضات واشکالات کا جائزہ

ہم نے پہلے باب میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ہمارے علماء، دینی سکالرز اور دانشوروں کو نہ صرف مغربی فکر و تہذیب کو ردّ کر دینا چاہیے بلکہ اس کو ردّ کرنے کے علمبردار بن کر کھڑا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہم نے نقلی اور عقلی دلائل دیے ہیں تاہم نظام تعلیم وتربیت اور عمومی ماحول کے غلط، غیر اسلامی اور مغرب زدہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں میں مغرب کی ذہنی وفکری غلامی عام ہے لہٰذا ممکن ہے قارئین کو ہمارے دلائل سے شرح صدر حاصل نہ ہو بلکہ ان کے ذہن میں بہت سے اشکالات، اعتراضات اور شبہات جنم لیں۔ اس لیے ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اس دوسرے باب میں ایسے حضرات کے ممکنہ اشکالات واعتراضات کا جواب دے دیں۔

یہ اعتراضات واشکالات مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں:

۱۔ اہل مغرب اہل کتاب ہیں لہٰذا وہ ہمارے حسنِ سلوک کے مستحق ہیں۔

۲۔ دنیاوی ترقی کے لیے مغرب سے استفادے میں کیا ہرج ہے؟

۳۔ مغربی تہذیب کے حوالے سے "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر عمل کیوں نہ کیا جائے؟

۴۔ مغرب کے اصول درحقیقت اسلامی اصول ہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انہوں نے ان اصولوں پر سنجیدگی سے عمل کیا ہے لہٰذا وہ کامیاب ہو گئے ہیں اور چونکہ ہم نے عمل نہیں کیا اس لیے ہم ناکام ہیں۔

۵۔ عرف کا اصول: پچھلی دو ڈھائی صدیوں سے مغربی اصول اور ان کے مطابق قائم کردہ ادارے مسلم معاشروں میں مروج ہیں، مسلمان ان سے مانوس ہو چکے ہیں اور ان کی حیثیت مسلمانوں کے لیے 'عرف' کی ہو چکی ہے اور عرف چونکہ حکم شرعی کے ضمنی مآخذ میں

سے ہے لہٰذا مغربی افکار اور اداروں کو قبول کر لینا چاہیے۔ تاہم اگر ان میں کوئی بات صریحاً خلاف اسلام ہو تو اسے اسلامی اصول وضوابط سے بدل لینا چاہیے۔

۶۔ مغرب سے سائنس و ٹیکنالوجی لینے میں کیا ہرج ہے کہ وہ تو اسلامی یا غیر اسلامی نہیں ہوتی؟

۷۔ مغرب سے کشمکش اور مسلح مزاحمت کی بجائے ڈائیلاگ اور افہام و تفہیم کا راستہ اپنانا چاہیے۔

اب ہم ایک ایک کر کے ان اشکالات واعتراضات کا جواب دیں گے۔ ان میں سے بعض سوالوں کا جواب ہم اپنی تحریروں ''مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل'' اور ''اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش'' میں دے بھی چکے ہیں، تاہم تکمیل بحث کی خاطر ہم یہاں بھی کچھ معروضات پیش کریں گے۔

پہلا اعتراض

مغربی تہذیب خود کو مذہب یا دین نہیں کہتی آپ خود ہی اسے دین کہنے پر اصرار کرتے ہیں اور خود ہی اس پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں۔ یہ کیا طرز عمل ہے؟

ہمارے اس موقف پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اہل مغرب اپنے نظام حیات کو ''تہذیب'' کہتے ہیں ''دین'' نہیں آپ خواہ مخواہ ان کی تہذیب کو خود ہی دین کہتے ہیں اور پھر دین ماسوا اللہ کہہ کر اسے ردّ کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سوال بجا ہے لیکن اس سے ہمارے موقف کی تردید نہیں ہوتی۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق کو سامنے رکھنا چاہیے:

رومن عہد سے لے کر مذہب کے علم برداروں یعنی عیسائی مذہبی قیادت (پاپائیت) نے سیاسی حکمرانوں اور جاگیرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا اور وہ اسٹیبلشمنٹ (یعنی حکمران طبقات) کا باقاعدہ اور موثر حصہ بن گئے۔ تحریک نشأۃ ثانیہ میں آزادی پسندوں اور

روشن خیالوں کو جس اسٹیبلشمنٹ سے لڑنا پڑا اور مزاحمت کر کے ان سے آزادی حاصل کرنا پڑی وہ ایک ''ٹرائیکا'' یا مجموعۂ شیاطین ثلاثہ تھا، یعنی تین قوتوں اور گروہوں سے مرکب ملوکیت یعنی بادشاہ، جاگیردار اور پوپ۔ لہٰذا جب عوام اس اسٹیبلشمنٹ کے خلاف اٹھے تو ان کے دل میں جہاں بادشاہوں اور جاگیرداروں سے نفرت تھی وہاں پوپ یعنی مذہبی قائدین سے بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب نے اس وقت کی پاپائیت اور اس کے مذہبی تصورات کی مزاحمت کی اور اس سے پیچھے چھڑایا تو پھر ہی ترقی کی، پھر ہی آزادی محسوس کی لہٰذا مغربی تہذیب اور مغرب کی ترقی نتیجہ ہے ملوکیت، جاگیرداری اور مذہبی پیشوائیت کے گٹھ جوڑ کو رد کرنے کا۔

لہٰذا یہ صحیح ہے کہ اہل مغرب نے اپنے ریلیجن کو چھوڑا اور اس سے پیچھے چھڑایا تو پھر ہی ترقی کی.... کیونکہ ان کا مذہب (ریلیجن) محرف شدہ عیسائیت تھی نہ کہ وہ صحیح عیسائیت جو حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اور اس مذہب میں بے شمار باتیں خلاف عقل و فطرت داخل کر دی گئی تھیں اور اس میں یونانی عہد کے ایسے سائنسی نظریے بھی بیان کیے گئے تھے جنہیں جدید سائنس دان بر بنائے تجربہ و مشاہدہ غلط ثابت کر رہے تھے لہٰذا اہل مغرب نے قرون مظلمہ اور تحریک نشاۃ ثانیہ کے بعد جب روشن خیالی اور جدیدیت کے دائرے میں قدم رکھا تو جن نظریات کو انہوں نے اپنایا اور انہیں اپنا منہج زندگی بنایا وہ ان کے ریلیجن (عیسائیت) پر مبنی نہیں تھے بلکہ اس کے خلاف تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے نئے منہج فکر و عمل کو یا اپنے نئے نظام حیات کو ریلیجن کہنے سے پرہیز کیا کیونکہ وہ کسی آسمانی ہدایت خصوصاً مسیحیت پر مبنی نہیں تھا بلکہ ان کے تجربہ و مشاہدہ اور ان کی اپنی عقل و فکر پر مبنی تھا نہ کہ عیسائیت پر۔ اگر وہ متاثر تھے تو یونانی فکر و تہذیب سے اور قانون میں رومن عہد سے اور یہ دونوں وحی سے محروم اور انسانی عقل و تجربات پر مبنی تھے۔

ریلیجن اور دین میں فرق

یہاں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ مسلمان جس چیز پر یقین رکھتے ہیں وہ ''دین'' ہے نہ

کہ مذہب (ریلیجن)۔قرآن حکیم نے بھی اسے دین کہا ہے[1]۔رسول کریم ﷺ نے بھی اسے دین ہی کہا ہے[2]۔جس کے لغوی اور اصطلاحی معانی ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ انگریزی لفظ ''ریلیجن'' سے جب اہل اردو کو سابقہ پڑا تو انہوں نے اس کا ترجمہ 'دین' کرنے سے احتراز کیا کیونکہ عیسائیت جس ''ریلیجن'' پر اس وقت استوار ہے یعنی اناجیل پر، ان میں کچھ اخلاقی اور روحانی تعلیمات تو ہیں لیکن وہ دین نہیں ہیں یعنی ان میں دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے مفصل احکام و تعلیمات موجود نہیں ہیں۔اس کے دو سبب ہیں: ایک تو یہ کہ حضرت عیسی علیہ السلام نئے نبی ضرور تھے لیکن وہ نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت (جو آج محرف شکل میں ہمارے پاس عہد نامہ عتیق (Old Testament) کی صورت میں موجود ہے) پر عمل کرنے والے تھے۔ مطلب یہ کہ جو کتاب اللہ تعالی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری تھی، گو وہ آج موجود نہیں ہے لیکن اگر وہ ہوتی بھی تو اس میں مکمل شریعت ہم نہ پاتے۔دوسری وجہ یہ کہ اگر اصل انجیل میں کوئی شرعی احکام تھے بھی تو وہ سینٹ پال نے، جو اصلاً یہودی تھا لیکن اس نے خود کو عیسائی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حواری قرار دے کر جب انجیل کا متن مدون و محفوظ کیا تو اس نے انجیل کے شرعی احکام کو بدل ڈالا یا نکال باہر کیا تا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی کتاب ''تورات'' (عہد نامہ عتیق) کے مقابلے میں نہ آسکے اور عیسائی یہودیت کے زیر اثر اور اس کے ماتحت ہی رہیں۔

ان دو باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت جو انجیل بلکہ اناجیل (یعنی انجیل کے مختلف ورژن (جیسے ہمارے ہاں احادیث رسول (ﷺ) کے مختلف مجموعے بخاری، مسلم، ترمذی.... وغیرہ) موجود ہیں ان میں شرعی احکام سرے سے موجود ہی نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب رومن بادشاہوں نے عیسائیت کو بطور مذہب قبول کیا تو اس کی روحانی و اخلاقی حیثیت کو تو

---

[1] آل عمران ۳:۱۹

[2] صحیح بخاری، رقم الحدیث:۴۶

قبول کیا لیکن قانون اپنا نافذ کیا (جسے رومن لاء کہا جاتا ہے) اور ریاست کا سیاسی و انتظامی ڈھانچہ بھی انہوں نے خود اپنی عقل اور تجربات سے وضع کیا اور اس کا ماخذ عیسائیت نہ تھی۔

اس لیے جب لفظ ریلیجن کا اردو سے سابقہ پڑا اور اہل اردو کو لفظ Religion کا اردو ترجمہ کرنا پڑا تو وہ اس کا ترجمہ ''دین'' نہ کر سکے کیونکہ عیسائیت میں کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں لہٰذا عیسائیت دین نہ تھی جب کہ اسلام دین تھا لہٰذا انہوں نے اس مشکل سے جان چھڑانے کے لیے ریلیجن کا ترجمہ 'مذہب' کر دیا جو دیکھا جائے تو غلط ہے کیوں کہ ''مذہب'' عربی لفظ ہے جس کے معنی مکتب فکر (School of Thought) کے ہیں۔ ظاہر ہے لفظ ''مذہب'' کو ہم دین کے معنوں میں نہیں لے سکتے جس طرح کہ ہم کہتے ہیں کہ مذہب حنفی، مذہب شافعی، یا مذاہب اربعہ جو چار سکول آف تھاٹ ہیں نہ کہ چار دین۔ لہٰذا ریلیجن کا ترجمہ دین بھی غلط ہے اور مذہب بھی۔ تاہم اگر یہ سمجھا جائے کہ موجودہ عیسائیت بھی ایک سکول آف تھاٹ ہے تو شاید اسے مذہب کہا جا سکے۔ ریلیجن کا ترجمہ بہرحال ''دین سماوی'' نہیں کیا جا سکتا، البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کی اصل ایک سماوی دین تھا جو اب محض ریلیجن بن کر رہ گیا ہے اور وہ عربی کے ''دین'' کے مترادف نہیں ہے۔

ہم ''دین موسوی'' کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو احکام و تعلیمات نازل کی گئی تھیں وہ بہرحال دین تھیں لیکن نہ موجودہ یہودیت مکمل دین ہے اور نہ موجودہ عیسائیت مکمل دین ہے بلکہ یہ انحراف شدہ سماوی تعلیمات کے مجموعے ہیں جن میں بہت کچھ لوگوں نے حک و اضافے کر دیے ہیں اور وہ اب اس شکل میں موجود نہیں جس میں وہ نازل کی گئی تھیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ قرون مظلمہ کے بعد جب تحریک نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تو ایک طرف جہاں پاپائیت کی مخالفت جاری تھی وہیں دوسری طرف اس کا ایک بنیادی پہلو نشأۃ علوم کا بھی تھا یعنی یونانی فکر کا احیاء اور اس کی پیروی۔ اور جیسا کہ معلوم ہے کہ یونانی فکر وحی کی ہدایت سے محروم ایک عقل پرستانہ تحریک تھی جسے مذہب یا دین مخالف تحریک یا دین کا ایک متبادل

وضعی دین بھی کہا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اہل مغرب نے نئی تہذیب کی بنیاد آسمانی ہدایت پر رکھنے کی بجائے (کہ اصل آسمانی ہدایت ان کے پاس تھی ہی نہیں بلکہ محرف شدہ پایا پائیت تھی جسے انہوں نے رد کر دیا) اپنی عقل وفکر پر رکھی اور ماضی کی عقل وفکر (یونانی فکر اور رومن تجربات) سے بھی استفادہ کیا اور وہ (یونانی اور رومی) فکر بھی وحی الٰہی کی ہدایت سے محروم تھی۔ یوں جدیدیت نے جس مغربی تہذیب کو پروان چڑھایا اس میں عیسائیت کا کوئی خاص کردار نہ تھا بلکہ اس کی بنیاد اس آئیڈیالوجی پر تھی جو ان کی عقل وفکر اور تجربات پر مبنی تھی (اس آئیڈیالوجی اور نظریات کا ذکر ہم پہلے باب کی پہلی دلیل میں تفصیل سے کر چکے ہیں)۔

دوسرا اعتراض

اہل مغرب اہل کتاب ہیں لہٰذا وہ ہمارے حسن سلوک اور دوستی کے مستحق ہیں

۱۔ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا دین ازل سے ''اسلام'' ہی رہا ہے اور دنیا میں جتنے بھی انبیاء آئے ہیں وہ سارے 'اسلام' ہی کے داعی اور علمبردار تھے اور اس 'اسلام' کو ماننے والے سب لوگ 'مسلمان' ہی تھے لیکن ان پیغمبروں کے انتقال کے بعد ان کے پیروؤں نے اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں تحریف کر دی اور پیغمبر کی لائی ہوئی تعلیمات میں اپنی مرضی سے حکّ واضافے کر لیے لہٰذا 'اسلام' ان کے پاس حقیقی صورت میں باقی نہیں رہا لہٰذا اب حقیقی دین صرف وہ 'اسلام' ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے گئے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی کتاب ''قرآن حکیم'' کی صورت میں موجود ہے۔ لہٰذا اب 'مسلمان' صرف وہ ہیں جو اس آخری نبی اور اس آخری کتاب کو مانیں اور ان کی پیروی کریں۔

رہے وہ لوگ جو اللہ کی طرف سے بھیجے گئے اس آخری دین 'اسلام' کو، اس کے آخری

رسول (محمد ﷺ) کو اور اس کی بھیجی گئی آخری کتاب (قرآن حکیم) کا انکار کریں تو وہ 'کافر' ہیں 'کافر' کے لفظی معنی ہیں انکار کرنے والا یعنی اللہ کی ہدایت کا انکار کرنے والا اور جو شخص ایسا کرے وہ کافر اور غیر مسلم ہے۔ البتہ کافر دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو اللہ، رسولوں اور آسمانی کتابوں کو سرے ہی سے نہ مانیں اور دوسرے وہ جو اللہ، رسول، کتاب کا اصلاً تو انکار نہ کریں لیکن حضرت محمد (ﷺ) کو اللہ کا رسول نہ مانیں اور جو کتاب اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کی ہے یعنی قرآن، اسے نہ مانیں تو وہ بھی کافر ہیں کیونکہ ایک رسول کا انکار سب کے انکار کے مترادف ہے اور اسی لیے مسلمان سارے پیغمبروں کو مانتے ہیں، لیکن یہود و نصاریٰ سابقہ رسولوں کو تو مانتے ہیں لیکن حضرت محمد (ﷺ) کو رسول نہیں مانتے لہٰذا وہ بھی کافر ہیں۔ البتہ پہلی اور دوسری قسم کے کفار میں فرق کرنے کے لیے اللہ و رسول (ﷺ) اور ان کے اتباع میں مسلمان دوسری طرز کے کافروں کو 'اہل کتاب' کافر کہتے ہیں۔ اہل کتاب کفار کے بار میں اسلام کے احکام تقریباً وہی ہیں جو مشرکین وملحدین کے ہیں یعنی ان پر اسلام پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ مان لیں تو وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح ہیں۔ یا وہ مسلمان تو نہ ہوں لیکن اسلام کی بالادستی تسلیم کرلیں تو اسلامی ریاست میں وہ بطور ذمی امن سے رہ سکتے ہیں[1] لیکن اگر وہ اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی کریں، ان کے خلاف سازشیں کریں، انہیں مٹانے کی کوشش کریں تو پھر مسلمان ان سے جنگ کر سکتے ہیں۔ تاہم ان میں اور دوسرے کفار میں فرق کرنے کے لیے جذبۂ خیر سگالی کے اظہار کے طور پر قرآن حکیم انہیں دو علامتی رعایتیں دیتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر ان کا ذبیحہ حلال ہو (یعنی وہ جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح کریں) تو مسلمان ان کا کھانا کھا سکتے ہیں اور اگر ان کی عورتیں

[1] باستثنیٰ نبی کریم ﷺ کے اس حکم کے کہ یہودیوں کو ان کی مسلسل بدعہدیوں اور سازشوں کی وجہ سے جزیرہ العرب سے نکال دیا جائے۔

(عفیفہ اور پاک دامن ہوں) تو مسلمان ان سے شادی کر سکتے ہیں[1]، جبکہ یہ دونوں رعایتیں مشرکین اور ملحدین کے لیے نہیں ہیں۔

۲۔ نبی کریم ﷺ کے عہد میں مندرجہ بالا اصولوں پر عمل اس طرح ہوا کہ یہودیوں نے اسلام اور مسلم دشمنی کی تو ان کے ساتھ جنگ ہوئی اور انہیں مدینہ سے نکال دیا گیا۔ خیبر میں بھی وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی سازشوں سے باز نہ آئے تو پھر ان سے جنگ ہوئی اور خیبر فتح کیا گیا اور ان سے مفتوح دشمنوں جیسا سلوک کیا گیا۔ پھر بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو آپ (ﷺ) نے حکم دیا کہ انہیں جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے۔

نجران کے عیسائیوں نے بحث و مناظرہ کیا، کامیاب نہ ہوئے تو اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے مطیع ہو گئے۔ لیکن رومی عیسائیوں نے آپ ﷺ کے سفیر کو قتل کر کے دشمنی کا ارتکاب کیا تو آپ ﷺ نے ان سے جنگ کی اور جنگ موتہ کا واقعہ پیش آیا۔ خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں نے روم کے اہل کتاب کفار اور ایران کے مجوسی کفار پر اسلام پیش کیا۔ ان کے حکمران چونکہ اسلام دشمنی پر تلے ہوئے تھے (ایرانیوں نے بھی آپ ﷺ کے سفیر کو قتل کر کے دشمنی کا ثبوت دیا تھا) اور اپنے عوام کے فہم اسلام میں مانع تھے لہٰذا مسلمانوں نے ان کی طاقت کو توڑنے کے لیے ان سے جنگ کی اور ان کا اکثر علاقہ فتح کر لیا۔ مفتوحہ علاقوں میں جب بعض صحابہ کرام نے کتابیہ عورتوں سے شادی کی (شام کا حسن معروف تھا اور ہے) تو امیر المومنین حضرت عمرؓ نے انہیں حکماً اس سے منع کر دیا[2] کہ مسلم ایلیٹ کا یہ رجحان مستقبل میں سنگین شرعی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے شام میں ایک ذہین اور لائق غیر مسلم بیوروکریٹ کو دیکھا جو اعلیٰ حکومتی حلقوں

---

[1] المائدہ ۵:۵

[2] الطبری، جامع البیان، ۳۶۶:۴

میں شامل ہوگیا تھا تو آپ نے اسے ہٹانے کا حکم دے دیا کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کا کلیدی عہدوں پر تقرر مسائل پیدا کر سکتا تھا۔[۱] بلکہ آپؓ نے غیر مسلم خواتین ورکرز (لونڈیوں/ باندیوں) کو معزز مسلمان خواتین جیسا لباس پہننے سے منع کر دیا تا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی اپنی اپنی شناخت باقی رہے۔[۲]

۳۔ عصر حاضر میں اسلام اور اہل کتاب کفار کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہنے چاہئیں:

مغرب کے مسیحی مغربی فکر وتہذیب قبول کر کے خود مسیحیت کو ردّ کر چکے ہیں یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ مسیحیت کو ردّ کرنے کے نتیجے میں یا اسے ردّ کرنے کے بعد ہوا ہے۔ اس کے دو سبب تھے: ایک یہ کہ مسیحی قیادت (پوپ) نے قرون مظلمہ میں حکمرانوں اور جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اور یوں اقتدار کا ایک ایسا ٹرائیکا (گروہ ثلاثہ) وجود میں آیا ہوا تھا جسے اپنے طبقاتی مفادات عزیز تر تھے اور جو عوام پر ظلم وستم کرنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں جب نشاۃ ثانیہ کی تحریک چلی، عوام میں بیداری پیدا ہوئی، سائنسی ترقی کی ابتداء ہوئی تو دانشور، سائنسدان اور باشعور عوام اس ٹرائیکا کو اور خصوصاً مسیحی قیادت (پاپائیت) اور اس کی فکر کو ردّ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مارٹن لوتھر کی تحریکِ اصلاحِ مذہب اسی کی ایک کڑی تھی۔

مسیحیت کو ردّ کرنے کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جب نشاۃ ثانیہ کی تحریک ابھر رہی تھی اور پوپ مخالف ماحول موجود تھا تو اہل دانش نے فکری رہنمائی کے لیے یونانی فکر وتہذیب کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی تہذیب اپنی بنیادی فکری اساسات میں یونانی فکر وتہذیب ہی کا تسلسل ہے۔ اور یہ امر معروف ومعلوم ہے کہ یونانی فکری

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ۶۸:۲

[۲] شبلی، الفاروق، ۲۷۹:۲

وتہذیب وحی کی ہدایت سے محروم تھی اور محض انسانی عقل ودانش کی پیداوار تھی۔اسی حقیقت کا پرتو ہمیں مغربی فکر وتہذیب میں نظر آتا ہے کہ وہ اپنی کنہ میں مذہب کی نقیض ہے اور اس کی مخالف اور اس سے متضاد ہے۔

ہیومنزم ،سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپیریسزم وغیرہ کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ اور ان سے پیدا ہونے والا ورلڈ ویو کس طرح نہ صرف اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت اور آخرت کے برعکس ہے بلکہ درحقیقت مذہب ہی کے خلاف ہے۔ ہیومنزم خدا کی خدائی کے خلاف انسان کی خدائی کا علم بردار ہے اور سیکولرزم نے مذہب خصوصاً مسیحیت کو کونوں کھدروں میں دھکیل کر گھر پر قبضہ کرلیا ہوا ہے۔لہٰذا اہل مغرب کی اکثریت ملحد ومشرک ہے اور برائے نام مسیحی ہے۔

۴۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہود ونصاری جس طرح عہد نبوی میں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے،اسی طرح وہ مابعد تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں کے حریف اور دشمن رہے ہیں جس کی گواہ صدیوں جاری رہنے والی صلیبی جنگیں ہیں۔مسلمانوں کے کمزور ہونے کی بناء پر انہوں نے مسلم ممالک کو کچل کر ان کے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور انہیں خوب لوٹا کھسوٹا، ان کا استحصال کیا اور انہیں تباہ وبرباد کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ مسلمان ممالک کو آزاد کرنے پر مجبور ہوئے تو انہوں نے چولا بدلا اور نئے استعماری انداز میں پُرامن طریقے سے مسلمانوں کو فکری اور عملی غلام بنائے رکھا اور جب اس کے باوجود کچھ مسلمان ممالک سر اٹھانے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے پھر پینترا بدلا اور اپنی جدید اور مہیب جنگی مشینری اور جھوٹے پروپیگنڈہ کے ذریعے ابھرتے ہوئے مسلم ممالک کو تباہ وبرباد کرنا شروع کر دیا۔عراق، افغانستان اور لیبیا اجڑ چکے، یمن اور شام ہماری آنکھوں دیکھتے تباہ کیے جا رہے ہیں اور ایران وپاکستان وغیرہ پر زبردست دباؤ جاری ہے۔

۵۔ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے۔ان کی اسلام اور مسلم دشمنی عیسائیوں سے بڑھ

کر ہے۔ آج کل انہوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی ہوئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں سے مل گئے ہیں ۔ امریکہ و یورپ کی مدد سے انہوں نے فلسطین سے فلسطینی مسلمانوں کو نکال باہر کر دیا ہے اور وہاں اسرائیل بنا کر قابض ہو گئے ہیں اور امریکہ و یورپ کی پشت پناہی سے مشرق وسطیٰ کے ہمسایہ ملکوں کے سینے پر مونگ دل رہے ہیں اور بیت المقدس پر قابض ہو چکے ہیں ۔ مسلمانوں کے خلاف صیہونیوں کے منصوبے ان کے ''پروٹوکولز'' سے ظاہر ہیں جن ''میں گریٹر اسرائیل'' کا منصوبہ بھی شامل ہے جس میں مدینہ شریف پر قبضہ بھی ان کی پلاننگ کا ایک حصہ ہے۔ امریکہ اور بھارت کے ساتھ مل کر وہ پاکستان کے خلاف بھی مکروہ سازشیں کرتے رہتے ہیں جن کا مقصد پاکستان کو کمزور کرنا، اس کی ایٹمی حیثیت ختم کرنا اور اسے بھارت کا طفیلی ملک بنانا ہے۔

۶۔ جو رعایتیں صدر اول میں اہل کتاب کفار کو دی گئی تھیں حالات ایسے ہیں کہ اب ان پر عمل بھی مشکل ہے کیونکہ ان کی عورتوں میں اب ایسی خواتین کا ملنا تقریباً ناممکن ہے جو عفیفہ اور پاکباز ہوں۔ اسی طرح ان کے ہاں اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا بھی تقریباً ناپید ہو چکا ہے کیونکہ مشینی ذبیحے نے اس کی گنجائش ہی ختم کر دی ہے۔

۷۔ قرآن وسنت میں یہود ونصاریٰ کے خلاف اور اسلام اور مسلمانوں سے ان کی دشمنی کے بارے میں اور مسلمانوں کو ان سے دوستی نہ کرنے کے حوالے سے جو نصوص موجود ہیں، ان کا ذکر بھی سابقہ سطور میں ہو چکا ہے۔

ان حالات میں یہ کہنا کہ مغرب کے مسیحی یا یہودی اہل کتاب ہیں اور ہمارے اور ان کے درمیان دوستی ہونی چاہیے، یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو قرآن وسنت سے ناواقف ہو، عقل سے پیدل ہو اور حمیت سے عاری ہو۔ وہ نہ چودہ سو سال پہلے والے اہل کتاب ہیں اور نہ ان سے دوستانہ تعلقات جائز اور ممکن ہیں۔

تیسرا اعتراض

دنیاوی ترقی کے لیے مغرب سے استفادے میں کیا ہرج ہے؟

۱۔ اس حوالے سے دو باتیں سمجھ لینا بہت ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ 'دنیاوی ترقی' سے کیا مراد ہے اور یہ کیسے حاصل ہوتی ہے؟ اور دوسرے یہ کہ 'معاشی ترقی' انسان کے مجموعی نظام فکر اور نظریہ حیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ اس سے جڑی ہوئی ہوتی ہے، اس کا ناگزیر حصہ ہوتی ہے اور اسے اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام میں ترقی کا تصور کیا ہے؟ ماضی میں مسلمانوں نے کیسے ترقی کی؟ اور آج وہ کیسے ترقی کر سکتے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ مغرب میں ترقی کا مفہوم کیا ہے اور اس نے یہ ترقی کیسے کی ہے؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے بعد ہی ہم یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ کیا مسلمان مغرب کی پیروی کر کے ترقی کر سکتے ہیں یا نہیں؟

۲۔ اسلام میں انسانی زندگی کا تصور یہ ہے کہ اس کے دو فیز یا مرحلے ہیں۔ پہلا فیز یا مرحلہ ہے اس دنیا کی زندگی اور دوسرا فیز ہے آخرت کی زندگی۔ آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ترجیح حاصل ہے کیونکہ وہ پائیدار اور ہمیشہ کی زندگی ہے جب کہ دنیا کی زندگی چند روزہ اور فانی ہے۔ آخرت میں کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ دنیاوی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزاری جائے۔ گویا یہ دنیا ہمارے لیے دار الامتحان ہے۔ یہاں جس طرح کا پرچہ ہم حل کریں گے اتنے ہی نمبر آخرت میں ملیں گے اور ہم پاس یا فیل ہوں گے اور اسی پر ہمارے گریڈ/درجے کا انحصار ہوگا۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "الدنیا مزرعة الآخرة"[1] یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہاں ہم جو کچھ بوئیں گے وہی آخرت میں کاٹیں گے۔

---

[1] یہ الفاظ اگرچہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہیں لیکن قرآن وسنت سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ غزالی نے إحیاء علوم الدین (جلد:4، ص:24) میں اور المناوی نے فیض القدیر شرح جامع الصغیر (جلد:3، ص:392) میں اس اثر کا ذکر کیا ہے۔

حاصل یہ کہ اسلام میں صرف دنیا کی کامیابی اور ترقی مطلوب نہیں بلکہ آخرت کی کامیابی بھی مطلوب ہے یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی بیک وقت مطلوب ہے۔لیکن قرآن نے 'دنیاوی کامیابی' یا 'دنیاوی ترقی' کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا بلکہ وہ اسے یوں کہتا ہے کہ "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿201﴾ "[البقرہ۲:۲۰۱]

یعنی اے ہمارے ربّ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اس ضمن میں قرآن وسنت کی تعلیمات کے استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی کامیابی یہ ہے کہ ہمارا ربّ ہم سے راضی ہو جائے اور ہمیں اپنی خوشنودی اور نعمتوں سے نوازے۔ آخرت میں ''ترقی'' کا مطلب یہ ہے کہ ہم وہاں اچھے گریڈ سے پاس ہوں۔ عام جنت کی بجائے جنت الفردوس ملے اور انبیاء کرام اور صدیقین کا ساتھ ملے۔ آخرت میں اس کامیابی کا انحصار 'دنیا میں کامیابی' اور 'دنیا کی ترقی' پر نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزاری یا نہیں؟ اس کام میں ہم جتنی زیادہ محنت کریں گے اتنا ہی اچھا گریڈ ملنے کی آخرت میں توقع کر سکیں گے۔

گویا دنیا میں ایک مسلمان کا ہدف اور اس کی کوششوں کا فوکس اس چیز پر ہونا چاہیے کہ وہ دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے میں زیادہ سے زیادہ محنت کرے۔ اس کے نتیجے میں دنیا میں 'کامیابی' اور 'ترقی' ملے نہ ملے آخرت میں کامیابی اور ترقی ضرور ملے گی۔

دنیا میں بھی ایک چیز البتہ اسے لازماً ملے گی اور وہ ہے خوشی اور اطمینان "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿28﴾ "[1] [الرعد۱۳: ۲۸] اور یہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے

---

[1] اللہ کے ذکر سے مراد صرف ''اللہ کے نام کا ورد کرنا'' نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود عبودیت کاملہ ہے یعنی اللہ کی کما حقہ عبادت و اطاعت کرنا۔

کیونکہ یہ کافر کو دنیا کی ساری سہولتیں، آسائشیں اور کروڑوں اربوں روپے میسر ہونے کے باوجود نہیں ملتی اور ایک مسلمان اس سے متمتع ہوسکتا ہے خواہ وہ فقیر اور محتاج نانِ جویں ہی کیوں نہ ہو!

اللہ کی ہدایت پر چلتے ہوئے دنیا میں بھی کامیابی اور ترقی ملتی ہے لیکن یہ صرف اس صورت میں مل سکتی ہے جب دوسرے افراد، معاشرہ اور ریاست بھی دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزارنے میں آپ کی ہم نوا ہو۔ اگر ایسا ہوتو معاشرہ کے دوسرے افراد اور ریاست کے کارکن آپ کا ساتھ دیں گے، آپ کے ساتھ تعاون کریں گے اور آپ خوش وخرم، خوشحال اور کامیاب زندگی گزاریں گے۔ لیکن اگر معاشرہ کے افراد اور ریاست کے کارکن اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی نہ گزارنا چاہیں، صرف آپ اکیلے ہی اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا چاہیں تو وہ آپ کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے، آپ کے لیے قدم قدم پر مشکلات کھڑی کریں گے اور آپ دنیاوی لحاظ سے نہ کامیاب ہوں گے اور نہ ترقی کرسکیں گے، ہاں آخرت میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

۳۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ اسلام کی ہدایت کے مطابق زندگی نہ گزار کر بھی آپ دنیاوی لحاظ سے 'کامیاب'، 'ترقی یافتہ' اور مالی لحاظ سے خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں لیکن اس کے دو نتیجے لازماً نکلیں گے:

ایک یہ کہ آپ کو دنیا میں خوشی اور اطمینان نصیب نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ:

۔ ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴾[طٰہٰ۲۰:۱۲۴]

یعنی جو اللہ کی معصیت میں زندگی گزارے گا اس کی زندگی ضیق اور تنگی میں گزرے گی خواہ اس کے پاس ساری دنیا کی دولت اور آسائشیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اور آپ کھلی

آنکھوں سے یہ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ دولت امریکہ کے پاس ہے لیکن وہاں کے لوگ ہی دنیا میں سب سے بڑھ کر ناخوش ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ:

- وہاں جرائم ساری دنیا سے زیادہ ہیں۔
- وہاں خودکشیاں دنیا میں سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔
- وہاں دنیا میں سب سے زیادہ پاگل خانے، ذہنی امراض کے کلینک اور ہسپتال ہیں۔

دوسرا حتمی نتیجہ اللہ کی معصیت کا یہ نکلے گا کہ وہ آخرت میں ناکام ہوں گے اور اللہ کی ناراضی اور جہنم کا دائمی عذاب انہیں ضرور ملے گا۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے)۔

۴۔ اسلام مسلمانوں کو دنیا میں غلبے، کامیابی اور ترقی کی ضمانت ضرور دیتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ سب مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزاریں یعنی صرف ایک یا چند افراد کا انفرادی تقویٰ کافی نہیں بلکہ مسلمان بحیثیت امت، معاشرہ اور ریاست بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کریں۔

یہ بات قرآن حکیم میں کئی جگہ فرمائی گئی ہے:

- ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران ۳:۱۳۹]

یعنی تمہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ مطلب یہ کہ اگر تم اپنے ایمان میں سچے ہو تو تم ہی غالب رہو گے کیونکہ سچے ایمان کا لازمی نتیجہ عمل صالح ہے اور عمل صالح کا لازمی نتیجہ صلاحیت میں دوسروں پر برتری ہے۔

- ﴿اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ﴾ [هود ۱۱:۵۲]

''اور اے قوم! اپنے پروردگار سے بخشش مانگو پھر اس کے آگے توبہ کرو۔ وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار مینہ برسائے گا اور تمہاری طاقت میں اضافے پر اضافہ کرے گا اور (دیکھو)

اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب نہ ہونا۔

۔ ﴿اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَکِّنْ لَّکُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْھِمْ مِّدْرَارًا ۠ وَّجَعَلْنَا الْاَنْھٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمْ فَاَھْلَکْنٰھُمْ بِذُنُوْبِھِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِھِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ﴾ [الانعام ۶:۶]

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کو ہم نے زمین میں تم سے بھی زیادہ اقتدار بخشا تھا۔ ہم نے ان پر آسمان سے خوب مینہ برسایا اور ان کے ہاں نہریں جاری کر دیں لیکن پھر ان کو ان کی معصیت کے سبب ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری قومیں پیدا کر دیں۔''

یعنی تم اللہ کی اطاعت کی زندگی گزارو، پھر اگر اس میں کوئی کمی کوتاہی ہو جائے تو اللہ سے معافی مانگ کر راہ راست اختیار کر لو تو میرے حکم پر زمین تمہارے لیے سونا اگلے گی اور آسمان تم پر ہُن برسائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں سے دنیا میں کامیابی، ترقی اور غلبے کا وعدہ اس صورت میں پورا نہیں ہو سکتا کہ چند مسلمان اپنی ذاتی اور انفرادی زندگی میں اللہ کے مطیع اور فرماں بردار بن جائیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ سارے مسلمان، پوری امت، مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست سب کے سب اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کی زندگی گزاریں اور کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ ساری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کریں۔

۵۔ اب آیئے اس طرف کہ اہل مغرب نے جس طرح کامیابی حاصل کی ہے اور ترقی کی ہے اور جس طرح ان کی فکر اور تہذیب اس وقت دنیا میں غالب ہے کیوں نہ ہم بھی ان کی پیروی کر کے ہم بھی کامیابی حاصل کر لیں اور ان ہی کی طرح ترقی کر لیں؟

دیکھیے! یہ ممکن نہیں ہے اور اس کے کئی اسباب ہیں جو آسانی سے قابل فہم ہیں مثلاً:

۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارا اور ان کا کامیابی اور ترقی کا بنیادی مفہوم، منہج اور

ماڈل (پیراڈائم) ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ وہ صرف دنیا کی کامیابی چاہتے ہیں اور آخرت ان کے پیش نظر نہیں جب کہ ہم دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی چاہتے ہیں۔

۔ جہاں تک دنیا میں کامیابی، ترقی اور غلبے کے حصول کا تعلق ہے تو اس کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ آپ اس کی اہلیت اور صلاحیت رکھتے ہوں بلکہ صلاحیت اور میرٹ میں دوسروں سے آگے ہوں۔ اہلیت اور صلاحیت رکھنے اور اس میں دوسروں سے آگے نکلنے کا نسخہ یہ ہے کہ آپ نہ صرف اپنے نظریۂ حیات اور مقصد زندگی سے کمٹمنٹ اور شدید وابستگی رکھتے ہوں بلکہ اس میں دوسروں سے آگے ہوں۔ ایک فرد جتنی زیادہ شدید وابستگی اپنے نظریۂ حیات سے رکھتا ہے اتنا ہی اس کی بنیادی انسانی صلاحیتیں ابھرتی ہیں جیسے محنت اور جدوجہد، ایثار وقربانی، اطاعت امیر، تنظیم اور منصوبہ بندی، قانون کی پیروی....وغیرہ۔ مسلمانوں کے عروج کا سبب یہ تھا کہ ہر مسلمان اپنے نظریۂ حیات سے شدید وابستگی رکھتا تھا ۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کی ایسی تربیت کی کہ ہر مسلمان اپنے نظریۂ حیات پر جان نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ اس سے مسلمانوں میں صلاحیتوں کا ایسا جوار بھاٹا پھوٹا جس نے صدیوں تک انہیں معلوم دنیا کا امام بنا دیا۔ پھر ان میں زوال آیا تو اس وجہ سے کہ وہ غفلت اور تساہل کا شکار ہوگئے، دنیاوی وسائل کی کثرت نے انہیں آرام پسند اور کاہل بنا دیا اور دین کے ساتھ ان کی وابستگی کمزور پڑ گئی۔ اس کے نتیجے میں ان کی صلاحیتیں اور دنیا میں قطع اسباب کے لیے درکار اہلیتیں ختم ہوتی چلی گئیں اور وہ آہستہ آہستہ زوال کے گڑھے میں ڈوبتے چلے گئے۔

۶۔ مغرب کی کامیابی وترقی کا راز بھی یہی ہے کہ اس نے پہلے اپنے آدمی کو بدلا۔ اس نے وحی کی ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور عقل کی بالادستی کی قائل یونانی تہذیب سے ناطہ جوڑ کر اور اس کی پیروی کر کے انسان کی خدائی کا اعلان کر دیا۔ ان کا نظریۂ حیات جو بھی تھا، انہوں نے خلوص سے اس کی اطاعت کی اور اس سے شدید وابستگی کے نتیجے میں ان

کی صلاحیتیں ابھر آئیں اور مسلمان چونکہ اس وصف سے محروم ہو چکے تھے لہٰذا اہل مغرب مسلمانوں پر غالب آ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کو غلام بنالیا۔ ان کو تباہ و برباد کیا، لوٹا کھسوٹا، پھر ان کا اجتماعی نظام اور ڈھانچہ منہدم کر کے اپنی فکر و تہذیب کے مطابق اس کی تشکیل نو کی خصوصاً ان کے نظام تعلیم وتربیت کو بدلا اور انہیں اپنا فکری غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

۷۔ اب مسلمانوں کی دنیا میں کامیابی اور ترقی کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور نظریۂ حیات سے سچ مچ وابستہ ہو جائیں۔ اپنے فرد کو بدلیں تا کہ ان کے اندر وہ بنیادی انسانی اوصاف پیدا ہوں جو دنیا میں کامیابی اور ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اگر وہ اس کے لیے مغرب کی پیروی کریں گے تو چونکہ ان کی تہذیب اور ان کی فکر (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپیر یسزم) الحاد پر مبنی ہے انکارِ خدا و رسول اور انکارِ آخرت ووحی پر مبنی ہے اور اسلام کی مخالف اور اس سے متضاد ہے تو اس صورت میں وہ فکری یکسوئی سے محروم ہو جائیں گے اور فکری انتشار میں مبتلا ہو کر اپنی صلاحیتیں کھو بیٹھیں گے۔ اعلیٰ کردار سے محروم ہو جائیں گے اور دنیا میں آگے بڑھنے کی سکت اور حوصلہ کھو دیں گے۔ یوں نہ وہ اِدھر کے رہیں گے اور نہ اُدھر کے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر بن جائیں گے بلکہ ان پر وہ مثال صادق آئے گی کہ دھوبی کا کتا، نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

لہٰذا مسلمانوں کی اس دنیا میں کامیابی اور ترقی کا راز یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کی پیروی کرنے لگیں بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات پر یکسو ہو جائیں اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزاریں اور مغرب کی فکر اور تہذیب کو رد کر دیں جو ان کے دین سے مختلف اور متضاد ہے اور اہل مغرب ان کے اور ان کے دین کے دشمن ہیں۔ انہوں نے نہ صرف ماضی میں انہیں غلام بنایا اور لوٹا کھسوٹا بلکہ وہ آج بھی انہیں تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ انہوں نے عراق، افغانستان اور لیبیا کو تباہ کر دیا ہے، شام اور یمن تباہ کیے جا رہے ہیں اور پاکستان

وایران پر شدید دباؤ اوران کے خلاف سازشیں جاری ہیں۔لہٰذا مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ مغربی فکرو تہذیب کو ردّ کردیں اور اسلام اور اسلامی تعلیمات پر یکسوئی سے عمل پیرا ہوں اور دنیا وآخرت دونوں کی کامیابیاں سمیٹیں۔

۸۔ جب وہ طے کرلیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں کہ ان کی کامیابی کا راز اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے نہ کہ مغربی فکرو تہذیب کو اپنانے میں،تو پھر ہر تہذیب اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دوسری تہذیبوں کے تجربات سے تھوڑا بہت استفادہ کرہی لیتی ہے۔ہم مسلمان بھی مغرب کے انسانی تجربات سے کچھ سیکھ سکتے ہیں اور کچھ ایسی چیزیں ان سے لے سکتے ہیں جو خلافِ اسلام نہ ہوں اور پھر انہیں اپنی ضرورت کے تحت تبدیل کرکے اپنے لیے قابل عمل بنا سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کی اس دنیا میں کامیابی اور ترقی کے لیے اسلامی اصولوں پر عمل ضروری ہے اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ماسوا اسلام سارے نظریات کو خصوصاً مغربی فکرو تہذیب کو ردّ کردیں تاکہ ان کی فکری یکسوئی ان کے اعمال صالحہ اور صلاحیتوں کی افزائش کا سبب بن سکے۔

چوتھا اعتراض

مغربی تہذیب کے حوالے سے ’خذ ما صفا ودع ما کدر‘ کے اصول پر عمل کیوں نہ کیا جائے؟

'خذ ما صفا ودع ما کدر' کا مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی مصفّی یعنی مفید اور اچھی چیزیں لے لی جائیں اور گدلی یعنی غلط اور مشکوک چیزیں چھوڑ دی جائیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ 'صفا' اور 'کدر' سے یہاں کیا مراد ہے؟ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مغربی فکر وتہذیب اپنی بنیادی آئیڈیالوجی اور ورلڈ ویو کے لحاظ سے الحادی اور اسلام سے متضاد ہے لہٰذا مغربی فلسفۂ علم اور اس کے تحت نمو پانے والے سارے علوم، تصورات اور اداروں پر اس الحاد اور دین دشمنی کے گہرے اثرات ہیں لہٰذا وہ سب علوم، تصورات اور ادارے ہم مسلمانوں کے لیے نا قابل قبول ہیں جو مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہیں کیونکہ وہ سب ہمارے لیے 'کدر' ہیں، ہمارے لیے غیر تعمیری اور غیر مفید ہیں۔ بلکہ ہمیں صاف کہنے دیجیے کہ وہ مسلمانوں کے لیے مضر ہیں، ان کے دین وایمان کے خلاف ہیں اور دین پر ان کی یکسوئی ختم کرنے والے، انہیں فکری انتشار میں مبتلا کرنے والے اور انہیں دین اور دینی تعلیمات اور اصول واقدار سے دور لے جانے والے ہیں لہٰذا وہ ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔ وہ سب ہمارے لیے 'کدر' ہیں اور ہمیں انہیں اصولاً قبول نہیں کرنا چاہیے۔

تاہم مغربی فکر وتہذیب کو، اس کے تصورات اور اداروں کو اصولاً ردّ کرنے کے بعد ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ دنیا کی کوئی تہذیب دوسری تہذیبوں اور افکار سے لاتعلق نہیں رہ سکتی اور نہ کوئی تہذیب ہوا بند خانوں میں پروان چڑھتی ہے بلکہ ہر تہذیب اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دوسری تہذیبوں سے استفادہ کرتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ لہٰذا ہم مسلمان بھی مغربی تہذیب سے وہ چیزیں لے سکتے ہیں جو Value-loaded نہ ہوں بلکہ اس کے انسانی تجربات کا حاصل ہوں۔ پھر ان چیزوں کو ہم اپنے فکری وتہذیبی رنگ میں ڈھال کر انہیں اپنے لیے مفید اور قابل قبول کر سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کا یہاں یہی مفہوم لیا جا سکتا ہے اور

لیا جانا چاہیے اور ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اگر کوئی 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کا یہ مطلب لے کہ ہمیں مغربی فکر وتہذیب کی ساری باتیں قبول کر لینی چاہئیں تو ظاہر ہے اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم تقریباً دوسو سال تک مغرب کے غلام رہے ہیں اور مغربی استعمار کی سازشوں، منصوبہ بندی اور ہمارے اجتماعی ڈھانچے خصوصاً نظام تعلیم وتربیت کے انہدام اور اہل مغرب کی اسے اپنی فکر کے مطابق تعمیر نو کرنے کی وجہ سے اس نے ہمیں فکری غلامی کی گہری تربیت دی ہے اور چونکہ بدقسمتی سے مغرب کا نظام تعلیم وتربیت آج بھی مسلم ممالک میں جاری وساری ہے لہٰذا ہمارے حکمران طبقے، دانشور اور پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت آج بھی مغربی تہذیب سے مرعوب ہے بلکہ ان کی فکری غلام ہے۔ اس لیے ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کو بہانہ بنا کر ہم مغربی فکر وتہذیب ہی کو حیلے بہانے نہ اپنا لیں اور اس کی پیروی کرنے لگ جائیں۔

پانچواں اعتراض

مغرب کے اصول درحقیقت اسلامی ہیں

بہت سے مسلمان اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ مغرب اس لیے کامیاب اور ترقی یافتہ ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر عمل کرتا ہے اور مسلمان اس لیے غریب، پسماندہ اور پیچھے رہ گئے ہیں کہ انہوں نے ان اسلامی اصولوں پر عمل چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا ہمارے مغرب کی پیروی کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے اور اس کے کئی اسباب ہیں جن میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ دنیا میں عروج اور ترقی وکامیابی کے اصول واسباب کیا ہیں؟

۲۔ یہ ایک مغالطہ ہے کہ مغرب کے اصول اسلامی ہیں۔

۳۔ اگر مغرب کے اصول اسلامی نہیں ہیں تو پھر وہ کامیاب اور ترقی یافتہ کیوں ہے؟

۴۔ اگر مسلمانوں کے اصول صحیح ہیں تو وہ غریب اور پسماندہ کیوں ہیں؟

۵۔ اگر اسلام اور مغرب ایک دوسرے سے متضاد ہیں تو اسلامی اور مغربی تہذیب میں مماثلتیں کیوں ہیں؟

اب ہم ان نکات کی کچھ وضاحت کریں گے:

۱۔ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ دنیا میں عروج اور ترقی و کامیابی کے اصول واسباب کیا ہیں؟

یہ موضوع کہ دنیا میں عروج و ترقی اور زوال کے اصول کیا ہیں؟ مسلمان کیوں زوال پذیر ہوئے؟ اہل مغرب کافرانہ اور فاسد نظریات کے حامل ہونے کے باوجود کیوں غالب و بالا دست ہیں؟ اور مسلمان دوبارہ عروج کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ ایک اہم اور طویل موضوع ہے۔ اس پر ہماری ۴۰۷ صفحات کی کتاب ''مسلم نشأة ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل'' موجود ہے۔ جن اصحاب کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ اس کتاب کا مطالعہ کر لیں۔ یہاں ہم چند سطور میں اپنے موقف کا خلاصہ پیش کریں گے:

❁ دنیا میں عروج، ترقی اور کامیابی کا اصول یہ ہے کہ جس قوم کے افراد میں دنیا میں قطع اسباب کی اہلیت وصلاحیت دوسروں سے زیادہ ہو تو وہ ان پر غالب آجاتی ہے اور وہ خوب ترقی کرتی ہے۔

❁ قطع اسباب کی اہلیت وصلاحیت انسانوں میں کیسے پیدا ہوتی ہے؟ یہ اہلیت ان میں پیدا ہوتی ہے اس نظریہ حیات سے وابستگی کے نتیجہ میں جس میں وہ یقین رکھتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ نظریہ حیات صحیح ہو، فطری ہو اور اسلامی ہو بلکہ وہ جیسا بھی ہو، اس سے وابستگی اور پختگی کی شدت انسانوں میں محرک عمل بنتی ہے اور ان میں وہ بنیادی انسانی اوصاف پیدا کرتی ہے جو دنیا میں قطع اسباب کے لیے ضروری ہیں جیسے محنت کی عادت، آگے بڑھنے کا جذبہ، اطاعت امیر، اپنے نظریہ حیات کے لیے اخلاص اور ایثار، پلاننگ اور منصوبہ

بندی، تنظیم امور، قانون کی پابندی وغیرہ۔

* نظریۂ حیات سے وابستگی محرک عمل ضرور بنتی ہے۔ اگر یہ فطری اور صالح اصولوں پر مبنی ہو تو اس کا نتیجہ انسانوں اور قوموں کے لیے مفید اور تعمیری ثابت ہوگا اور اگر وہ نظریۂ حیات غیر صالح اور غیر فطری اصولوں پر مبنی ہوگا تو آگے چل کر اس کا نتیجہ لازماً فساد فی الارض کی صورت میں نکلے گا۔

۲۔ یہ ایک مغالطہ ہے کہ مغرب کے اصول اسلامی ہیں

یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے مغربی تہذیب اور اس کی فکری اساسات کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ یعنی یہ بات کہنے کی وجہ مغرب سے ناواقفیت اور جہالت ہے ورنہ ہم نے اس کتاب کے پہلے باب میں مغربی تہذیب کی جو فکری اساسات بیان کی ہیں اور انہی کے فلاسفروں اور دانشوروں کے حوالے سے بیان کی ہیں، انہیں جان کر کوئی مسلمان، بقائمی ہوش وحواس، یہ نہیں کہہ سکتا کہ مغربی تہذیب کے اصول اسلامی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے بنیادی اصول ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم سارے کے سارے سرتاپا غیر اسلامی ہیں اور وہ مل کر جو ورلڈ ویو بناتے ہیں وہ توحید، رسالت، آخرت اور وحی کی نفی کرتا ہے، تو اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ مغرب کے اصول اسلامی ہیں۔

اس غلط فہمی یا مغالطے کی وجہ یہ ہے کہ اہل مغرب کے اصول وعقائد تو غلط ہیں لیکن ان اصول وعقائد سے سنجیدہ وابستگی کی وجہ سے ان کے اندر وہ بنیادی انسانی اوصاف پیدا ہو گئے ہیں جو دنیا میں قطع اسباب کے لیے ضروری ہیں اور جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یعنی محنت ومشقت کی عادت، اپنے نظریے کے لیے ایثار وقربانی کا جذبہ، تنظیم، منصوبہ بندی، بہادری، اطاعتِ امیر، قانون کی پابندی وغیرہ۔ اور جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ یہ اوصاف کسی بھی نظریۂ حیات سے وابستگی سے پیدا ہو جاتے ہیں خواہ وہ غلط ہو یا صحیح۔ البتہ اس کا آخری نتیجہ ان پر

عمل سے نکلتا ہے۔ جو قوم اور تہذیب غلط نظریۂ حیات پر کھڑی ہو وہ خود بھی فنا ہوتی ہے اور دوسرے انسانوں اور تہذیبوں پر بھی برے اثرات ڈالتی ہے۔ اور اگر کسی تہذیب وقوم کا نظریۂ حیات (یعنی ایمانیات وعقائد) صحیح ہوں تو وہ قوم یا تہذیب دوسرے انسانوں کے لیے بھی رحمت اور مفید ثابت ہوتی ہے اور خود بھی اس وقت تک عروج پر رہتی ہے جب تک اس کے نام لیوا اس پر صدق دل سے عمل کرتے رہیں۔

خلاصہ یہ کہ مغربی تہذیب کے افراد میں یہ بنیادی انسانی اوصاف بلاشبہ آج موجود ہیں جس کی وجہ ان کی اپنے نظریۂ حیات سے شدید وابستگی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ان کا نظریۂ حیات صحیح ہے یا ان کے اصول وایمانیات صحیح ہیں۔ اسی طرح آج مسلمانوں میں یہ بنیادی انسانی اوصاف نہیں پائے جاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات سے سنجیدہ اور شدید وابستگی نہیں رکھتے لیکن اس کی وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا نظریۂ حیات غلط ہے یا ان کے اصول وایمانیات غلط ہیں بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ ان کے عقائد وایمانیات تو صحیح ہیں لیکن ان سے عدم کمٹمنٹ کی وجہ سے وہ ان کے دل ودماغ میں راسخ نہیں ہیں (شرعی اصلاح میں ہم اسے یوں کہیں گے کہ ان کا ایمان ویقین پختہ نہیں ہے یا ان میں منافقت آ گئی ہے کہ زبان سے تو اقرار کرتے ہیں لیکن دل ودماغ ان کی حقانیت پر مطمئن نہیں ہے یا زبان سے تو وہ ان عقائد وایمانیات کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے کیونکہ ان کا ایمان ویقین پختہ نہیں ہے) لہٰذا ایمان ویقین کی اس کمزوری کی وجہ سے یہ ایمانیات وعقائد مطلوبہ نتائج نہیں پیدا کر رہے لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان لوگوں کے عقائد وایمانیات یا ان کا نظریۂ حیات غلط ہے۔

۳۔ اگر مغرب کے اصول اسلامی نہیں ہیں تو وہ پھر کامیاب اور ترقی یافتہ کیوں ہیں؟

دیکھیے! دنیا کی چلت پھرت اور اس میں آل واولاد اور دولت کی کثرت اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ اللہ اس قوم سے خوش ہے یا وہ اللہ کی پسندیدہ قوم ہے۔ انسانوں کے

بارے میں اللہ کی اسکیم جو قرآن حکیم سے واضح ہوتی ہے، یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو اس زمین پر ایک وقت مقرر (قیامت) تک کے لیے بھیجا ہے[1] اور اس کے لیے زندگی گزارنے کے وسائل اسے مہیا کیے ہیں[2] اور ساتھ ہی اسے راہ راست دکھانے کے لیے اپنے پیغمبر اور رسول بھی بھیجے ہیں لیکن اس نے انسانوں کو آزادی بھی دی ہے کہ وہ چاہیں تو اللہ اور اس کی ہدایت کو مانیں اور چاہیں تو نہ مانیں۔ لیکن دونوں صورتوں کا نتیجہ بھی بتا دیا ہے کہ پہلی صورت میں آخرت میں اللہ کی خوشنودی اور ہمیشہ کی زندگی کی نعمتیں (جنت میں) ملیں گی۔ اور دوسری صورت میں آخرت میں اللہ کی ناراضی اور نافرمانی کی سزا (جہنم کی صورت میں) ملے گی۔

جہاں تک دنیا کی زندگی کا تعلق ہے تو روزی روٹی سب کو ملے گی خواہ کوئی نیک ہو یا بد، خواہ کوئی اللہ کو ماننے والا ہو یا اس کا انکار کرنے والا۔ بلکہ جو قطع اسباب کی زیادہ صلاحیت رکھنے والا ہوگا اسے دنیا زیادہ ملے گی (خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان)۔ آج کافروں (اہل مغرب) میں قطع اسباب کی صلاحیت مسلمانوں سے زیادہ ہے تو ان کے پاس دنیا مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ پہلے ایک ہزار سال تک مسلمانوں میں قطع اسباب کی صلاحیت زیادہ تھی تو دنیا ان کے پاس زیادہ تھی اور کافروں (اہل مغرب) کے پاس کم تھی۔

البتہ دنیا کی زندگی کے بارے میں ایک بات اور اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان فرد اللہ پر سچا ایمان رکھتا ہے تو اس کے نتیجے میں وہ دنیا میں اطمینان قلب کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے[3] خواہ وہ دنیاوی مال ومتاع میں کم ہو۔ اور کافر جو نعمت ایمان اور عمل صالح سے محروم ہوتا ہے اس کی زندگی عدم اطمینان، قلق اور پریشانی سے گزرتی ہے خواہ

[1] الصافات ۳۷:۱۴۸
[2] یس ۳۶:۴۴
[3] الرعد ۱۳:۲۸

ساری دنیا کی دولت اس کے پاس ہو۔ یہ دونوں مظاہر آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں اللہ کے ایسے بندے بہت ہیں جن کے دل سکون واطمینان کا گہوارہ ہیں اور دوسری طرف (مثلاً) امریکہ ہے جس کے پاس دنیا جہاں کی دولت، آسائشیں، سہولتیں بلکہ سامان عیاشی ساری دنیا سے زیادہ ہے لیکن دنیا میں سب سے زیادہ ناخوش امریکی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ سب سے زیادہ خودکشیاں وہاں ہوتی ہیں، سب سے زیادہ جرائم وہاں ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ ذہنی امراض کے ہسپتال وہاں ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ ہم نے اس سوال کا جواب دے دیا ہے کہ اہل مغرب 'کامیاب' اور 'ترقی یافتہ' کیوں ہیں اس کے باوجود کہ ان کا نظریہ حیات غیر فطری اور اسلام مخالف ہے۔

۴۔ اگر مسلمانوں کے اصول صحیح ہیں تو وہ غریب، پسماندہ اور ناکام کیوں ہیں؟

ذہین قاری سمجھ سکتا ہے کہ سطور بالا میں اس کا جواب آچکا۔ تاہم اس کے باوجود ہم وضاحت کیے دیتے ہیں۔

دیکھیے جناب! مسلمانوں کے اصول صحیح ہیں لیکن وہ اس لیے دنیا میں غریب، پسماندہ ناکام اور رسوا ہیں کہ وہ ان اصولوں پر عمل نہیں کر رہے۔ اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جسمانی لحاظ سے کمزور ہو اور حکیم اسے کہے کہ دودھ پیو اور مکھن کھاؤ اور وہ کہے جی یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میرے گھر میں بھینس ہے، دودھ بھی ہے اور مکھن بھی.... لیکن وہ عملاً نہ دودھ پیے نہ مکھن کھائے تو کیا اس کی صحت بہتر ہو جائے گی؟ ظاہر ہے وہ بدستور کمزور اور لاغر ہی رہے گا۔

اور اگر آپ کہیں کہ ہم تو نماز پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں تو اس کے دو جواب ہیں:

ایک تو یہ کہ کتنے لوگ، کتنے فیصد لوگ نماز پڑھتے ہیں؟ ہمارا اندازہ ہے کہ پاکستان کی ۲۲ کروڑ آبادی میں سے نمازی ۵، ۷ فیصد سے زیادہ نہیں۔ گویا لوگوں کی بہت بڑی اکثریت نماز نہیں پڑھتی۔ ہم نے نماز کی مثال اس لیے دی کہ یہ ظاہری عبادت ہے، ہر مسلمان بالغ

مرد وعورت پر دن میں پانچ بار فرض ہے اور ہر مسلمان کو خواہ وہ ان پڑھ اور دیہاتی ہو، یہ جانتا ہے کہ نماز فرض ہے اور مردوں پر مسجد جا کر با جماعت نماز پڑھنا فرض ہے لہٰذا اس کا اندازہ کرنا آسان ہے۔ چلیے! اگر کوئی ہمارے اندازے کو غلط سمجھے تو اسے دگنا کر لے، تگنا کر لے پھر بھی اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ہماری بہت بڑی اکثریت نماز نہیں پڑھتی۔

دوسرے یہ کہ اس بات کو بھی ہر مسلمان خواہ وہ اَن پڑھ ہو یا پڑھا لکھا، دیہاتی ہو یا شہری جانتا ہے کہ دین صرف نماز روزے کا نام نہیں بلکہ دین نام ہے ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزارنے کا۔ یہ ایک پورا پیکج ہے۔ اگر ہم اسے صحیح سمجھیں گے اور ہمارے عقائد صحیح ہوں گے اور ایمان پختہ ہوگا اور مسلمانوں کی اکثریت سارے شعبہ ہائے حیات میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوگی تو اس کا نتیجہ بھی یقیناً مثبت نکلے گا ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

مسلمانوں کی دین داری کی مثال گھڑی کی سی ہے۔ گھڑی میں بہت سے پرزے ہوتے ہیں۔ سارے پرزے ٹھیک ہوں تو پھر ہی گھڑی صحیح وقت دے گی۔ اگر صرف دو چار پرزے ٹھیک ہوں اور باقی سارے پرزے خراب ہوں تو گھڑی کبھی صحیح وقت نہیں دے گی۔ تو ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی گھڑی کے سارے پرزے ٹھیک رکھیں۔ اگر نہ ہوں تو گھڑی ساز سے ٹھیک کرائیں کیونکہ جب سارے پرزے ٹھیک ہوں گے تو ہی گھڑی صحیح وقت دے گی اور اگر ہم صرف دو چار پرزے ٹھیک کرائیں اور باقی پرزے خراب رہیں اور ہم یہ توقع کریں کہ گھڑی صحیح وقت دے گی تو یہ ممکن نہیں۔

اور اگر ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے ہمسائے کا گھڑیال تو صحیح چل رہا ہے اور ٹھیک ٹائم دے رہا ہے اور ہماری گھڑی ٹھیک ٹائم نہیں دے رہی اور ہم اس گھڑیال کے پرزے نکال کر اپنی گھڑی میں لگائیں اور یہ توقع کریں کہ ہماری گھڑی ٹھیک ہو جائے گی اور صحیح ٹائم

دینے لگے گی تو یہ ہماری حماقت ہے کیونکہ اس گھڑیال کے پُرزے تو اس کے حساب سے بنائے گئے ہیں وہ ہماری گھڑی میں فِٹ ہی نہیں بیٹھیں گے اور نہ ان پرزوں کے لگانے سے ہماری خراب گھڑی صحیح ہوگی اور نہ صحیح وقت دے گی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری گھڑی صحیح ٹائم دے تو ہمیں اپنی گھڑی کے سارے پرزے ٹھیک کرنے ہوں گے تبھی وہ صحیح وقت دے گی۔

اگر ہماری اسلامی تہذیب کی گھڑی صحیح نتائج نہیں دے رہی، صحیح وقت نہیں بتا رہی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ہمسایوں کی مغربی تہذیب کے گھڑیال سے جو صحیح وقت دے رہا ہے کچھ پرزے نکال کر اپنی گھڑی میں لگا لیں اور یہ توقع کریں کہ یہ اب صحیح وقت دے گی۔ تو یہ صحیح طرزِ عمل نہیں ہے اور نہ اس طرح ہماری گھڑی صحیح وقت دے گی۔

مسلمان بلاشبہ اس وقت غریب، پسماندہ اور ناکام ہیں لیکن اس کا صحیح حل یہی ہے کہ وہ اپنے اصولوں پر عمل کریں، اپنے منبع قوت کی طرف لوٹیں، اپنے دین کی ہر بات پر عمل کریں نہ کہ مغربی تہذیب کی چکا چوند سے متاثر و مرعوب ہو کر اس کی پیروی شروع کر دیں۔

۵۔ اگر اسلام اور مغربی تہذیب ایک دوسرے سے متضاد ہیں تو ان میں بعض مماثلتیں کیوں ہیں؟

قارئین! ہم نے سطورِ سابقہ میں ثابت کیا کہ اسلام اور مغربی تہذیب ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہیں۔ ان کا تصورِ دنیا، ان کا تصورِ انسان اور تصورِ علم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہاں تک کہ ان کا دنیا میں کامیابی اور ترقی کا ماڈل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اتنے اختلافات اور تضادات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں کئی چیزیں مشترک ہیں مثلاً ان کے سیاسی نظام میں اور ان کے معاشی نظام میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام میں بھی موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب ہم اسلام اور مغربی تہذیب کو ایک دوسرے سے متناقض اور متضاد کہتے ہیں تو ہمارے اور ان کے تصورات اور اقدار میں یہ مماثلتیں اور یکسانیت کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ بنیادی اختلافات اور تضادات کے باوجود کئی امور میں

اسلامی اور مغربی تہذیب میں بعض مماثلتیں موجود ہیں لیکن ان مماثلتوں کے باوجود ان سے ہمارے اس موقف پر زد نہیں پڑتی کہ یہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ یہ بات آپ اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب آپ ان مماثلتوں کے اسباب پر غور کریں جن میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ مغربی تہذیب اپنی اساس میں عقل پرستانہ تہذیب ہے اور اس کی بنیاد وحی پر نہیں عقلِ محض پر ہے۔ اسلام عقل کی نہ مخالفت کرتا ہے اور نہ مذمت بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ معیارِ حق نہیں۔ بہت سی نیکیاں اور نیک اعمال ایسے ہیں جن کا عقل ادراک کر سکتی ہے اور اگر لوگ وحی کو نہ مانیں تو بھی ان نیکیوں کا ادراک وہ کر سکتے ہیں لہٰذا ضروری نہیں کہ عقل سے مدرک ہر بات غلط، غیر صالح اور خلافِ وحی ہو۔ مثلاً عقل اس چیز کا ادراک کر سکتی ہے کہ دوسرے انسانوں سے دھوکہ اور فراڈ کرنا قبیح فعل ہے۔ اب اگر اہل مغرب خوراک میں ملاوٹ نہیں کرتے اور مسلمانوں کو بھی اللہ و رسول نے حکم دیا ہے کہ کسی کو دھوکہ نہ دو اور ملاوٹ نہ کرو تو دونوں میں اشتراک قابل فہم ہے لیکن دونوں میں اس کی اساس مختلف ہے۔ مغربی تہذیب میں اس کی بنیاد عقل ہے اور اسلام میں اس کی بنیاد وحی ہے۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ اہل مغرب اپنے اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور چیزوں میں ملاوٹ نہیں کرتے لیکن مسلمان دعوی خدا و رسول کی اطاعت کا کرتے ہیں لیکن ان کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور چیزوں میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ ان کی یہی منافقت اور اپنے نظریۂ حیات سے بے وفائی ان کے زوال کا سبب ہے۔

۲۔ جب سے انسان زمین پر آباد ہوا ہے وہ پہلے دن سے شعوری زندگی بسر کر رہا ہے (بندر سے انسان نہیں بنا) اور انسانوں کے دو بڑے گروہ شروع ہی سے موجود رہے ہیں۔ ایک وہ جو خدا اور رسول، آخرت اور وحی کو مانتا تھا اور اس سے اسلامی یا وحی پر مبنی تہذیبیں وجود میں آئیں۔ اور دوسرا وہ جو ان باتوں کو نہیں مانتا تھا اور اس سے غیر اسلامی تہذیبیں وجود میں آئیں۔

پھر یوں ہوا کہ جو لوگ وحی کی بالادستی کو مانتے تھے انہوں نے وحی کے احکام میں اپنی مرضی سے کمی بیشی کر لی (دین میں تحریف کر ڈالی) اور دین اپنی صحیح شکل میں باقی نہ رہا بلکہ اپنی بگڑی ہوئی شکل میں تاریخ کے سفر میں انسانوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔ اس طرح وحی پر مبنی احکام کی کئی باتیں، صحیح یا بگڑی ہوئی شکل میں، ان غیر اسلامی تہذیبوں اور گروہوں کی روزمرہ زندگی میں انسانی رسوم ورواج کی صورت میں شامل ہو گئیں مثلاً خدمت خلق کی مختلف صورتیں یہودیت اور مسیحیت میں (تحریف کے باوجود) اور مغربی تہذیب میں ایسی کئی چیزیں موجود ہیں جو اسلامی تعلیمات میں بھی موجود ہیں۔

اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تہذیبیں ہوا بند خانوں میں نہیں پروان چڑھتیں بلکہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دوسری تہذیبوں سے اخذ واستفادہ کرتی اور ان کی ایسی چیزوں کو جو اصولاً اس کے خلاف نہ ہوں، لے کر انہیں اپنے رنگ میں ڈھال کر انہیں استعمال کرتی ہیں جیسے حضرت عمرؓ نے مالی اور انتظامی ڈھانچے کی بعض چیزیں اہل فارس سے لے لیں یا جیسے مغربی تہذیب نے سائنس وٹیکنالوجی کے اصول مسلمانوں سے لے لیے۔

۳۔ جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ نظریۂ حیات سے افراد کی وابستگی ان کے اندر کچھ بنیادی انسانی اوصاف پیدا کر دیتی ہے خواہ وہ نظریۂ حیات صحیح ہو یا غلط جیسے محنت کی عادت، قربانی وایثار کا جذبہ، اطاعتِ امیر، نظم وضبط، ہم خیالوں سے اتحاد وتعاون وغیرہ۔ یہ بنیادی انسانی اوصاف دنیا میں قطع اسباب اور حصول رزق میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اہل مغرب چونکہ اپنی فکر وتہذیب سے شدید وابستگی رکھتے ہیں اس لیے ان میں یہ خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ صدرِ اسلام میں مسلمانوں میں بھی یہ خوبیاں اپنے دین سے شدید وابستگی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھیں۔ مطلب یہ کہ مختلف قوموں اور تہذیبوں میں یہ انسانی اوصاف مشترک ہو سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کچھ چیزیں مشترک ہیں اور ہو سکتی

ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے مسلمان اہل مغرب کی اندھی پیروی شروع کر دیں اور اپنے اصول و اقدار سے دست بردار ہو جائیں بلکہ جیسا کہ ہم سطور بالا میں بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں اور اہل مغرب میں اختلاف اور دوری کے متعدد اسباب ہیں جن میں سے چند اہم یہ ہیں:

۱۔ مغربی تہذیب کے بنیادی افکار (ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپیریلزم وغیرہ) اپنی کنہ میں غیر اسلامی ہیں اور کفر و شرک والحاد کے علمبردار ہیں۔

ان افکار سے اہل مغرب کا جو ورلڈ ویو (تصور الٰہ، تصور انسان، تصور کائنات) بنتا ہے وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات (توحید، رسالت، آخرت) کے بالکل متضاد ہے۔

۲۔ مغربی تہذیب مذہب (عیسائیت) کو پچھاڑ کر اور اسے کونوں کھدروں میں دھکیل کر ان کے معاشرے اور ریاست پر غالب آئی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کے تعصّبات بہت گہرے اور شدید ہیں، یہودی اور مسیحی ہونے کے ناطے بھی اور اسلام اور مسلمانوں کو اپنی تہذیب کے حریف سمجھنے کی وجہ سے بھی۔

۳۔ تجربے نے یہ بتایا ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار ممالک اسلام اور مسلمانوں کو کچلنا اور مٹانا چاہتے ہیں جیسے انہوں نے ماضی میں مسلمانوں کو شکست دے کر ان کے ملکوں پر قبضہ کر کے انہیں غلام بنا لیا، لوٹا کھسوٹا اور تباہ و برباد کیا۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب وہ انہیں مزید غلام رکھنے کے قابل نہ رہے تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف پر امن محاذ کھول لیا لیکن اس کے باوجود جب بعض مسلمان ممالک مضبوط ہو گئے تو انہوں نے امریکی سربراہی میں دوبارہ مسلم ممالک کو قوت سے کچلنا اور تباہ کرنا شروع کر دیا۔ عراق، افغانستان اور لیبیا تباہ کیے جا چکے، یمن اور شام برباد کیے جا رہے ہیں اور پاکستان و ایران پر دباؤ جاری ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں، علیم و خبیر ہیں، دلوں کے بھید جانتے ہیں اور ماضی میں

جو کچھ ہو چکا، حال میں جو کچھ ہو رہا ہے اور مستقبل میں جو کچھ ہو گا.... اس سب سے واقف ہیں اور ان کا علم حتمی اور سچا ہے اور اپنی کتاب (قرآن حکیم) میں انہوں نے لکھ دیا ہے کہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے دشمن اور بدخواہ ہیں۔

ان دلائل سے واضح ہے کہ مسلمانوں کو مغربی فکر و تہذیب کو ردّ کر دینا چاہیے اور دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے اسلامی اصولوں پر عمل کرنا چاہیے لیکن مسلمانوں کی نالائقی یہ ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کے بارے میں نہ دینی مدارس میں کچھ پڑھایا جاتا ہے اور نہ کالجوں یونیورسٹیوں میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ مغربی فکر و تہذیب کی حقیقت سے واقف ہیں اور نہ کالجوں یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ۔ الیکٹرانک، پرنٹ اور سوشل میڈیا پہلے ہی مغرب زدہ ہے اور اسلام کی بجائے مغربی فکر و تہذیب اور اس کے تصورات، اقدار اور اداروں کے فروغ کے لیے کام کر رہا ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں کے لیے مغربی فکر و تہذیب کے شرک و الحاد اور اسلام سے متضاد ہونے کی حقیقت کو سمجھنا مشکل ہے اور اسی طرح مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار ممالک کے اسلام اور مسلم دشمن اقدامات بلکہ انہیں تباہ و برباد کرنے کی حکمت عملی اور لائحہ عمل کا ادراک کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان حقائق کا ادراک ہی آج کے مسلمان کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے اور ان حقائق کو نہ سمجھنا ہی آج کے مسلمان کا المیہ ہے۔

چھٹا اعتراض

عرف کا اصول

عرف فقہ اسلامی میں حکم شرعی کا ایک ضمنی اور ذیلی ماخذ ہے۔ بایں معنی کہ اسلامی احکام

عموماً اوامر ونواہی کی شکل میں ہوتے ہیں۔بعض اوامر ایسے ہوتے ہیں جنہیں قرآن وسنت نے تو فرض وواجب نہیں کیا ہوتا لیکن چونکہ وہ مقاصد شریعت کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں لہٰذا لوگ ان پر فتحًا للذریعہ عمل کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح بعض نواہی ایسے ہوتے ہیں جنہیں قرآن وسنت نے حرام اور مکروہ نہیں کہا ہوتا لیکن چونکہ وہ مقاصد الشریعہ کو پورا کرنے والے ہوتے ہیں لہٰذا لوگ انہیں سدًا للذریعہ مکروہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے اوامر ونواہی معاشرتی رسوم ورواج کی صورت میں مسلم معاشروں میں مروج ہوجاتے ہیں اور انہیں عرف کی بنیاد پر قابل قبول سمجھا جاتا ہے مثلاً ہمارے ہاں وسطی پنجاب کے دیہات میں اس کا رواج تھا کہ اگر کسی گھر میں کوئی شخص فوت ہوجائے تو اس کے رشتہ دار یا ہمسائے دو تین دن تک سادہ کھانا گھر والوں اور مہمانوں کو مہیا کرتے تھے تا کہ اس مشکل وقت میں گھر والوں کو کھانا پکانے کا تردد نہ کرنا پڑے۔

اسی طرح راقم جن قاری صاحب کے ہاں بچپن میں قرآن پڑھنے جاتا تھا وہاں یہ قاعدہ نافذ تھا کہ جس بچے کے ہاتھ سے قرآن چھوٹ کر زمین پر گر جائے اس کو یہ جرمانہ ہوتا تھا کہ وہ گھر سے اس کے ہم وزن گندم لے کر آئے۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ بچے قرآن مجید کا احترام کریں اور اسے بے احتیاطی سے زمین پر نہ پھینکیں۔ ظاہر ہے یہ بات عرفاً صحیح ہے گو قرآن وسنت میں کہیں نہیں لکھی۔

اب یہاں بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ پچھلی دواڑھائی صدیوں کے عرصے میں اہل مغرب کے استیلاء کی وجہ سے ان کے بعض افکار اور ادارے مسلمانوں میں 'معروف' کی شکل اختیار کر گئے ہیں اور لوگ ان کے عادی ہو چکے ہیں مثلاً برصغیر میں ایک عرصے سے لوگ بلدیاتی اور سیاسی امور میں انتخابات کے وقت ووٹ ڈالنے کے عادی ہو چکے ہیں لہٰذا اب انتخابات کی حیثیت عرف کی سی ہو چکی ہے اور ان کے غیر اسلامی ہونے کی بحث نہیں اٹھانی چاہیے کیونکہ اسلام بھی شوریٰ کا حکم دیتا ہے لیکن اس کی کوئی خاص شکل معین نہیں کرتا اور

ووٹ ڈالنا گویا مشاورت میں حصہ لینا ہے۔

ہمیں ان لوگوں کے اس موقف پر دو اعتراض ہیں: ایک تو یہ کہ انگریزوں نے دور غلامی میں ہمارے جو اجتماعی ادارے منہدم کیے وہ اسلامی اصولوں کی تطبیق کی ایک توسیعی شکل تھے اور جو اجتماعی ادارے انہوں نے قائم کیے وہ ان کی فکر و تہذیب کے عکاس تھے لہٰذا پہلی بات تو یہ ہے کہ جو کام انگریزوں نے کیا وہ انہوں نے قوت اور جبر سے کیا اور مسلمانوں کی مرضی یا مشاورت سے نہیں کیا بلکہ وہ اکراہ ہی کی ایک شکل تھی اور جبر و اکراہ کے غیر اسلامی ہونے پر مسلمان اہل علم متفق ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان امور کو مباحات میں شمار کرنا غلط ہے کیونکہ ان انتخابات میں بہت سے امور ایسے ہیں جو خلافِ اسلام ہیں مثلاً کسی شخص کا خود امیدوارِ منصب بننا، اپنی جھوٹی تعریفیں کرنا اور لوگوں سے جھوٹے وعدے کرنا اور فیصلہ میرٹ اور غیر جانبداری سے نہ ہونے دینا بلکہ اس کے لیے پیسے خرچ کرنا یا خوف کی فضا قائم کرنا یا جاہلی تعصّبات کو ہوا دینا جیسے برادری، لسانی، علاقائی اور مذہبی و سیاسی تعصّبات کو فروغ دینا اور ان کی بنیاد پر ووٹ مانگنا اور لینا دینا۔ خلاصہ یہ کہ ان معاملات کو وہ عرف قرار نہیں دیا جا سکتا جو اسلام میں معتبر ہے۔

ساتواں اعتراض

مغرب سے سائنس و ٹیکنالوجی لینے میں کیا ہرج ہے کہ وہ تو غیر اسلامی نہیں ہوتی؟ اور وہی ترقی کی بنیاد ہے۔

ہم مغربی علوم، تصورات اور اداروں کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک وہ Value-loaded ہوتے ہیں یعنی وہ مغربی فکر وتہذیب کے ملحدانہ اور مشرکانہ افکار سے بننے والے ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کی پیداوار ہوتے ہیں لہٰذا ان کے تصورات اور اداروں میں الحاد وشرک خون کی طرح رواں دواں ہوتا ہے اس لیے وہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے اور نہیں ہونے چاہئیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر خون میں انفیکشن ہو جائے تو چونکہ خون سارے جسم میں گردش کرتا ہے لہٰذا خون کی انفیکشن آناً فاناً سارے جسم میں پھیل جاتی ہے اور اسے زہر آلود کر دیتی ہے یا اس کی مثال سانپ کے زہر کی ہے کہ جو زہر سانپ میں ہوتا ہے وہی سنپولیوں (یعنی سانپ کے بچوں) میں بھی منتقل ہو جاتا ہے۔

ہمارے معترضین کہتے ہیں کہ بفرضِ محال ہم آپ کی یہ بات مان بھی لیں تو اس کا اطلاق عمرانی علوم (Social Sciences) پر ہوتا ہے نہ کہ خالص سائنسی علوم پر۔ کیونکہ خالص سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی تو ریاضیاتی علوم کی طرح (یعنی ۲+۲=۴ کی طرح) فطری اور بدیہی حقائق پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں ظن وتخمین کا گزر نہیں ہوتا لہٰذا مغرب کی پیدا کردہ سائنس وٹیکنالوجی پر تو آپ کا یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا لہٰذا اسے قبول کرنے میں آپ کو کوئی مانع نہیں ہونا چاہیے۔ اور مغرب کی سائنس ٹیکنالوجی میں پیش رفت ہی ان کی دنیاوی کامیابی اور ترقی کی کلید ہے لہٰذا مسلمان بھی مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی اختیار کر کے مغرب کی طرح ترقی کر سکتے ہیں۔

ہم اس اشکال کو رد کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ معترض کا موقف دو مفروضوں پر مبنی ہے:

ایک: یہ کہ مغرب کی ترقی کی بنیاد سائنس وٹیکنالوجی پر ہے۔

دوم: یہ کہ سائنس وٹیکنالوجی Value loaded یا نظریاتی نہیں ہوتی بلکہ کسی بھی مذہب، نظریے، تہذیب اور تمدن سے تعلق رکھنے والا انہیں اختیار کر سکتا ہے اور ترقی کر سکتا

ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں مفروضے غلط ہیں۔ پہلا مفروضہ اس لیے غلط ہے کہ دنیا میں ترقی کی بنیاد انسان ہوتا ہے نہ کہ اس کے حاصلاتِ علم وفن۔ معاشرہ انسانوں سے مل کر بنتا ہے اور تہذیب ان انسانوں کے افکار واعمال کی مظہر ہوتی ہے۔ ہم یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ترقی کا حقیقی سبب انسان اور اس میں واقع ہونے والی تبدیلی ہوتی ہے نہ کہ اس کے ذرائع اور حاصلات۔ ذرائع تو انسانوں کی اختراع ہوتے ہیں اور ان کی کامیابی کے مظہر، نہ کہ اس کا سبب۔

اسلام آیا تو اس نے انسانوں کو بدل دیا۔ اس کا نتیجہ دنیاوی کامیابی اور ترقی کی صورت میں نکلا اور آخرت میں بھی وہ ان شاء اللہ کامیاب وکامران ہوں گے۔ یہ تبدیلی مسلمانوں کے لیے مفید اور تعمیری ثابت ہوئی۔ انہیں دنیا میں بھی کامیابی، ترقی، خوشحالی اور غلبہ ملا حالانکہ ان کی تہذیب میں سائنس، ٹیکنالوجی اور انڈسٹریالائیزیشن کی وہ ترقی ہمیں نظر نہیں آتی جو آج ہم مغرب میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی، نتیجہ ہے آدمی میں تبدیلی کا، نہ کہ سائنس وٹیکنالوجی ذریعہ ہے انسانی معاشرے کی ترقی کا۔ کامیابی کا بنیادی سبب ہوتا ہے انسان کی تبدیلی اور اس میں ان بنیادی انسانی اوصاف کا پیدا ہوجانا جو دنیا میں قطع اسباب اور کامیابی وترقی کے لیے ضروری ہیں۔ انسان کو بدلنے والی یہ قوت فکر یہ اگر ''الحق'' (Absolute Reality) کے صحیح تصور پر مبنی ہو تو اس کے متبعین کو کبھی زوال نہیں آئے گا الا یہ کہ وہ اس پر عمل چھوڑ دیں اور منافقت اختیار کر لیں۔ اور اگر یہ قوت فکر یہ 'الحق' کا غلط تصور رکھتی ہو (جیسا کہ مغربی تہذیب رکھتی ہے) تو وقتی ترقی کے باوجود اس کا نتیجہ لازماً فساد فی الارض کی صورت میں نکلے گا اور وہ دنیا میں تباہی وبربادی کا موجب بنے گی اور جلد ہی زوال پذیر ہوجائے گی جیسا کہ اقبال نے کہا تھا کہ ؂

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

اور ۔ یہ کہ فسادِ قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب

اور یہ کہ ۔

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھیے آخر کس کی جھولی میں گرتا ہے فرنگ

خلاصہ یہ کہ سائنس وٹیکنالوجی میں پیشرفت کو مغرب کی کامیابی وترقی کا سبب سمجھنا فریبِ فکر ونظر اور سطحی بات ہے۔ اگر آپ چیزوں کو ذرا گہری نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو احساس ہوجائے گا کہ یہ دنیاوی کامیابی کا مظہر اور سمبل ہے، نہ کہ اس کا سبب۔ اسی لیے اقبال کہتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال اور نکبت کا سبب مادی ذرائع کی قلت نہیں ہے ۔

سبب کچھ اور ہے تُو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اور یہ کہ مسلمان مغرب کی پیروی کر کے اور اس کی سائنس وٹیکنالوجی کو اپنا کر ترقی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا فکری ڈھانچہ اور روحانی قالب اہل مغرب سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ۔

اپنی ملت کو قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اس کی ایک تازہ مثال افغانستان کی ہے جہاں امریکہ اور یورپ لاکھوں کی فوج لاکر اور جدید ترین اسلحہ لے کر حملہ آور ہوئے لیکن نہتے افغان مہاجرین کی تحریک مزاحمت اور ان کے صبر اور مسلسل جدوجہد نے امریکہ ویورپ کی مجموعی قوت کو شکست دے دی اور یوں سائنس وٹیکنالوجی ایمان کے ہاتھوں ہار گئی اور اب امریکہ Face Saving کے لیے بھرپور جدوجہد کر رہا ہے تا کہ اس کی باقی ماندہ فوجیں وہاں سے عزت سے واپس آسکیں۔

ہمارے معترضین کا دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ مغرب کی سائنس وٹیکنالوجی Value

loaded نہیں ہے۔مطلب یہ کہ وہ مغرب کے فاسد و باطل اور مبنی بر الحاد و زندقہ نظریات کی پیداوار نہیں ہے بلکہ فطری، آفاقی اور ریاضیاتی اصولوں کی پیداوار ہے۔ان کا یہ مفروضہ بھی غلط فہمی اور کم علمی پر مبنی ہے۔ہم ہی اس کی تردید نہیں کرتے بلکہ خود مغربی اہل علم بھی ان کے اس موقف کی تردید کرتے ہیں۔مغربی دانشور اور فلاسفہ یہ تسلیم کر رہے ہیں کہ:

❁ کوئی بھی علم و فن معروضی اور غیر جانبدار نہیں ہوتا بلکہ اس علم و فن کو مدون کرنے والے کے خیالات و تصورات اس کی تخلیق و تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔دیکھیے اس ضمن میں کوپر اور کوہن کی تحریریں۔

❁ مغرب کی ٹیکنالوجی مذہب اور اخلاق دشمن ہے۔یہ ٹیکنالوجی ایسی اقدار کے فروغ کا سبب بنتی ہے جو مذہبی اقدار و روایات سے متضاد ہیں اور یہ مذہبی اقدار و روایات کو کچلتی اور ختم کر دیتی ہیں۔ٹیکنالوجی کے مضر اثرات پر مغربی دانشوروں اور فلاسفہ نے سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں اور اسے مذہب و اخلاق دشمن قرار دیا ہے دیکھیے مثلاً ہائیڈیگر کی '*The Question Concerning Technology*'۔

بظاہر یہی لگتا ہے کہ آلات اور مشینیں بے جان ہوتی ہیں لہٰذا ان کا صحیح استعمال مفید ہوتا ہے اور غلط استعمال نقصان دہ۔لیکن مشاہدہ و تجربہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ مفروضہ غلط ہے کیونکہ:

۔ ٹیکنالوجی کے استعمال کا تصور اس کے موجد اور تخلیق کار کے فکری رویوں سے تلازم رکھتا ہے مثلاً کیا وجہ ہے کہ مسلمان فقہاء اور دین دار حکمرانوں نے مسلم سائنسدانوں کی کبھی مخالفت نہیں کی بلکہ الٹا ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان سے تعاون کیا۔اور ان سائنسدانوں کے ہاتھوں سے کبھی کوئی ایسی ٹیکنالوجی وجود میں نہیں آئی جس نے اسلامی اقدار کو چیلنج کیا ہو یا انہیں مجروح کیا ہو۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب جو ٹیکنالوجی تخلیق کر رہا ہے جیسے انٹرنیٹ ،

کمپیوٹر، ٹی وی اور موبائل وہ اسلامی اقدار کو تہس نہس کر رہی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے عرض کی کہ موجد اور تخلیق کار کا فکری ڈھانچہ اور اخلاقی سانچہ اس کی ایجاد اور تخلیق کی نوعیت اور کارگردگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان سائنسدانوں کی ایجاد کردہ ٹیکنالوجی اسلامی روایات کے لیے چیلنج نہیں بنی لیکن مغرب کے ملحد سائنس دانوں کی ایجاد کردہ ٹیکنالوجی کو خود مغرب کے محققین و مفکرین دین و اخلاق دشمن قرار دے رہے ہیں۔

۔ مسلمان فقہاء اور اصولیین نے ایسے حالات کے لیے سدّ الذریعہ کا اصول وضع کر رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز آدمی کو حرام تک لے جائے وہ حرام ہے خواہ وہ اپنی اصلیت میں حرام نہ بھی ہو مثلاً اسلام مومن مردوں اور عورتوں کو حصول علم (ایسا علم جو کتاب وحکمت اور تزکیے پر مبنی ہو) پر ابھارتا ہے لیکن اس کی بنیاد پر یونیورسٹی میں بالغ اور غیر شادی شدہ نوجوان لڑکوں لڑکیوں کی آزادنہ مخلوط تعلیم کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ اخلاقی خرابیوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی پوزیشن انٹرنیٹ، تصویر، ٹی وی اور موبائل وغیرہ کی ہے کہ ان کا اکثر استعمال چونکہ غلط ہے، مفاسد پر مبنی ہے، اور اسلامی اقدار کو تباہ کر رہا ہے لہٰذا ان کے اصلاً مباح ہونے کے باوجود، سدّ اللذریعہ ان سے منع کیا جائے گا اور ان کے خلاف فتویٰ دیا جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ معترض کے دونوں مفروضے غلط ہیں۔ ترقی کی بنیاد سائنس وٹیکنالوجی نہیں، فرد کی تبدیلی (بذریعہ تعلیم وتربیت) ہے۔ اگر مسلمان دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ بھی اپنے فرد کو (تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کے ذریعے) تبدیل کریں تا کہ دنیا اور آخرت میں کامیابی اور ترقی کے لیے درکار صفات ان میں پیدا ہو جائیں اور وہ ایسی سائنس اور ٹیکنالوجی ایجاد کریں جو ان کی دینی اقدار و روایات کو فروغ دینے والی ہو نہ کہ انہیں منہدم کرنے والی۔

اور بالفرض اگر معترض کی بات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مسلمان سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کریں تو مسلمان سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کریں نہ! کس نے ان کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے؟ دینی علماء وسکالرز میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی اور کبھی نہیں کہا کہ مسلمان سائنسی مضامین کا مطالعہ نہ کریں یا تجربہ گاہیں نہ بنائیں یا سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت نہ کریں۔لیکن اس وقت تو یہ ہو رہا ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی تو مغرب کر رہا ہے اور مسلمان اس ٹیکنالوجی کی تیار کردہ اشیاء کو محض استعمال کر رہے ہیں۔وہ محض مستہلک یعنی خریدار اور کنزیومر ہیں نہ کہ ٹیکنالوجی پیدا کرنے والے۔ظاہر ہے کہ یہ صورت حال مضحکہ خیز ہے۔جہالت اور بے عقلی پر مبنی ہے۔اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں سائنس کی اعلیٰ تعلیم وتحقیق کا انتظام ہو، ان کے پاس بہترین لیبارٹریز ہوں۔مسلمان سائنسدانوں کو بہترین تنخواہیں اور سہولتیں ملیں اور وہ دن رات تحقیق میں مصروف ہوں اور نئی نئی ایجادات کریں۔کیا ترقی کا معیار اور طریقہ یہ ہے کہ اہل مغرب کی طرح پینٹ کوٹ ٹائی پہن لی جائے اور ان کی پیدا کردہ ٹیکنالوجی کو استعمال کرنا سیکھ لیا جائے؟ بریں عقل ودانش بباید گریست۔

آٹھواں اعتراض

مغرب سے کشمکش اور مسلح مزاحمت کی بجائے ڈائیلاگ اور افہام وتفہیم کا راستہ اپنایا جائے

یہ اعتراض کہ مسلمان انتہا پسند اور جنگجو ہیں اور پر امن مذاکرات اور ڈائیلاگ میں یقین نہیں رکھتے، بالکل بودا اور بے وزن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان مغرب سے شکست خوردہ ہیں، اس کے مقابلے میں سیاسی لحاظ سے، معاشی لحاظ سے، تعلیمی لحاظ سے، غرض ہر لحاظ سے کمزور ہیں ان میں اتفاق بھی نہیں اور وہ باہم دست و گریباں ہیں۔ لہٰذا وہ مغرب کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے اور نہ کسی مسلمان ملک میں اور اس کی قیادت میں اتنی ہمت ہے کہ وہ مغرب کا مقابلہ کرنے کا سوچے۔ مسلمان تو دو اڑھائی صدیوں تک مغرب کے غلام رہے ہیں اور اب بھی مسلمانوں کے اکثر حکمران، حکمران طبقات، عسکری اور سول بیوروکریسی، عدلیہ، سیاستدان، دانشور اور ادیب مغرب کے فکری غلام ہیں، وہ ان کے سامنے سر اٹھا ہی نہیں سکتے اور اس حالت کا اگر ہم میں سے کچھ کو شعور ہے تو مغرب ہی کو کیوں نہ ہوگا جس نے یہ سب کچھ پلاننگ سے کیا ہے۔

اصل صورتِ حال یہ ہے کہ مغرب جب تک چاہتا ہے پر امن انداز میں مسلمانوں کو آداب غلامی سکھا تا رہتا ہے اور اگر کوئی سرتابی کی کوشش کرے تو وہ ہوشیار نگران کی طرح ڈنڈا پکڑے کھڑا ہوتا ہے کہ جوں ہی کوئی سر اٹھانے کی کوشش کرے وہ ٹھک سے اسے ڈنڈا دے مارتا ہے۔ چنانچہ وہ صدام حسین، ملّا عمر اور قذافی کو سبق سکھا چکا ہے اور ان کی حکومتوں کو ختم کر کے ان کے ملک تباہ و برباد کر چکا ہے۔ یمن اور شام جل رہے ہیں اور پاکستان و ایران اس کے شدید دباؤ کی زد میں ہیں۔ ہمارے ہاں سوشلسٹ اور قوم پرست بھٹو اور اسلام پسند جنرل ضیاء الحق کا حشر کس کو یاد نہیں؟ لہٰذا یہ کہنا کہ مسلمان حکومتیں مغرب سے کشمکش کرنا یا اس کی مزاحمت کرنا چاہتی ہیں بالکل بے بنیاد بات ہے۔

ہاں! یہ صحیح ہے کہ مغرب کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر کچھ سر پھروں نے اس کو تنگ کرنا شروع کیا ہوا ہے جیسے افغان طالبان اور حماس وغیرہ۔ تاہم یہ ایسے ہی ہے جیسے چیونٹی ہاتھی کو زیر کرنا چاہے۔ اور مغرب کی خفیہ ایجنسیوں نے کمال مہارت اور دانشمندی سے ان مزاحمتی

گروپوں میں بھی اپنے آدمی داخل کر دیے ہیں اور وہ پاکستانی طالبان، القاعدہ، داعش وغیرہ کو بہت مہارت سے اپنی انگلیوں پر نچا رہا ہے۔ ان کی وجہ سے اس نے ان مزاحمتی سر پھروں کو جو خود کو ''مجاہدین'' کہلوانا پسند کرتے ہیں، دہشت گرد قرار دے رکھا ہے بلکہ ان کے بہانے وہ اپنے پروپیگنڈے کے زور پر اسلام کو دہشت گردی کا موید ثابت کر رہا ہے۔ ان کے آرٹسٹ ہمارے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کارٹون بنا کر انہیں دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے پادری سارے عالم میں اعلان کر کے قرآن جلاتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں یہ دہشت گردی کی حمایت کرتا ہے۔ اسی طرح مغرب نے سارے مسلمانوں کو، خصوصاً ان کو جو دینی چہرہ اور رجحانات رکھتے ہیں، دہشت گرد مشہور کر رکھا ہے حالانکہ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ اہل مغرب کے ظلم وستم پر سر نہیں دھنتے یا اس پر معمولی تنقید کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

المختصر یہ کہ یہ کہنا کہ مسلمان مغرب سے کشمکش کرنا چاہتے ہیں یا اس کی مسلح مزاحمت کرنا چاہتے ہیں، ایک بے حقیقت پروپیگنڈا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مغرب ہے جو اپنی طاقت، غلبے اور بالادستی کی وجہ سے کمزور اور منتشر مسلمانوں کو دبائے ہوئے ہے، ان پر زور زبردستی کر رہا ہے اور جس ملک کو چاہتا ہے تباہ وبرباد کر دیتا ہے اور اس کا جھوٹا الزام بھی مسلمانوں کے سر رکھ دیتا ہے جیسا کہ اس نے عراقیوں کے ساتھ کیا کہ ان کے خلاف کیمیائی تباہ کن ہتھیار رکھنے کا جھوٹا پروپیگنڈا زور وشور سے کیا اور عراق کو تباہ وبرباد کر دیا اور صدام کو پھانسی دے دی۔ بعد میں امریکی صدر اور برطانوی وزیر اعظم نے تسلیم کر لیا کہ عراق کے خلاف پروپیگنڈا جھوٹ پر مبنی تھا۔ یہ بالکل وہی صورتِ حال ہے جو ہم نے بچپن میں شیر اور میمنے کی کہانی پڑھی تھی کہ ایک میمنا نالے میں پانی پی رہا تھا کہ اوپر سے شیر آ گیا اور میمنے کے نرم گوشت کو دیکھ کر اس کی بھوک بھڑک اٹھی۔ اس نے میمنے سے کہا کہ تم میرا پانی گدلا کیوں کر رہے ہو؟ میمنے نے جواب دیا: اے جنگل کے بادشاہ! میں آپ کا پانی کیسے گدلا کر سکتا

ہوں، پانی تو آپ کی طرف سے میری طرف آ رہا ہے۔ شیر نے کہا: بکواس نہ کرو۔ تم نے پچھلے سال بھی میرا پانی گدلا کیا تھا۔ میمنے نے ڈرتے ہوئے کہا: حضور! میں تو پچھلے سال پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ شیر نے کہا: پھر تمہارے باپ نے کیا ہوگا۔ یہ کہا اور چھلانگ لگا کر میمنے کا گلا دبوچ لیا اور چیر پھاڑ کر اس کا گوشت کھا گیا۔ اسی کو کہتے ہیں۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مغرب سے افہام و تفہیم سے کام لیا جائے اور اس سے ڈائیلاگ کیا جائے۔ تو بلاشبہ اسلام کی یہی ہدایت ہے اور مسلمان اسی کے قائل ہیں لیکن اگر ڈائیلاگ میں ایک فریق غالب اور بالا دست ہو اور دوسرا کمزور اور مغلوب ہو تو پھر اسے ڈائیلاگ نہیں کہتے۔ یہ تو دب کر صلح کرنے والی اور غالب فریق کی من مانی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے والی بات ہوتی ہے۔ ڈائیلاگ تو انہی دو فریقوں میں ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے برابر ہوں اور دونوں کی پوزیشن مساوی ہو۔ تو مغرب اگر ہمیں مساوی حیثیت دے تو ڈائیلاگ ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں؛ لیکن مغرب چونکہ اس وقت بالا دست اور غالب ہے لہٰذا ڈائیلاگ کی کنجی اسی کے پاس ہے۔ کیونکہ ڈائیلاگ کی صورت میں اسے اپنی اونچی مسند سے اتر کر مسلمانوں کے برابر بیٹھنا پڑے گا۔ لہٰذا اس کے لیے تیاری اور آمادگی کی ضرورت مغرب کو ہے نہ کہ مسلمانوں کو۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت اسلام، مسیحیت اور یہودیت میں ڈائیلاگ کی ضرورت نہیں ہے کہ اس وقت ان میں کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ درحقیقت ڈائیلاگ کی ضرورت اسلام اور مغربی فکر و تہذیب میں یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں اور مغربی فکر و تہذیب کے علمبردار ممالک کو ہے۔ مغربی تہذیب درحقیقت اہلِ مغرب کا 'دین' بھی ہے۔ وہ بس اپنے ماضی کی وجہ سے اپنے نظریۂ حیات کو مذہب، دین اور ریلیجن کہنا پسند نہیں کرتے، ورنہ ہے وہ ان کا دین ہی۔ دین اس نظریۂ حیات کو کہتے ہیں جس کے مطابق انسان اپنی زندگی گزارے

اس لحاظ سے مغربی تہذیب اہل مغرب کا دین ہی ہے جو ان کے ورلڈ ویو کا تعین کرتا ہے، ان کے فلسفۂ علم کا تعین کرتا اور انہیں پوری زندگی گزارنے کا لائحہ عمل دیتا ہے اور یہ لائحہ عمل عیسائیت پر مبنی نہیں ہے بلکہ ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، اور کیپٹل ازم پر مبنی ہے لہٰذا یہ ڈائیلاگ اسی وقت مفید اور نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جب یہ حقیقی فریقین کے درمیان ہو یعنی اسلام اور مغربی فکر و تہذیب کے علمبرداروں کے درمیان۔

اس باب میں ہم نے اپنے اس موقف پر کہ مغربی فکر و تہذیب کو ردّ کرنا ایک شرعی اور ملی تقاضا ہے، چند اہم ممکنہ اشکالات و اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کرے یہ بعض لوگوں کی ذہنی تشفی کا باعث بنیں۔ اگر مزید اشکالات و اعتراضات ہمارے سامنے آئے تو ہم بخوشی ان کا جواب دینے کی کوشش بھی کریں گے، ان شاء اللہ۔

باب سوم

ردّ مغربی فکر وتہذیب کے تقاضے

اس کتاب کے پہلے باب میں ہم نے بتایا کہ شرعی وعقلی دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان

مغربی فکر وتہذیب کو رد کر دیں۔ ہمارے اس موقف پر جو ممکنہ اعتراضات وشبہات ہو سکتے تھے، ان کا جواب ہم نے دوسرے باب میں دینے کی کوشش کی ہے۔ اب اس آخری باب میں ہم اس بات پر غور کریں گے کہ اگر ہم مغربی فکر وتہذیب کو رد کر دیں، جیسا کہ شرعی وعقلی دلائل کا تقاضا ہے، تو اس کا کیا اثر ہمارے فکر وعمل پر پڑنا چاہیے۔ ہمیں کن افکار اور رویوں کو ترک کرنا چاہیے اور کن رجحانات اور رویوں کو اپنانا چاہیے۔

ان امور کو سمجھنے کے لیے ہم نے اس باب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے:

فصل اوّل: بنیادی تقاضا: مطالعۂ مغربی فکر وتہذیب

فصل دوم: فکری تقاضے: فکری استقلال، مغرب کی غلامی کا رد، اسلامائیزیشن کی بجائے اسلامی تشکیلِ نو اور تجدد کی نفی۔

فصل سوم: عملی تقاضے: دینی تحریکوں، اداروں اور معاشرے کے مختلف طبقات کے لیے لائحہ عمل کی تبدیلی۔

فصل اوّل

بنیادی تقاضا - مطالعۂ مغرب

۱۔ ہم اگر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمیں مغربی فکر وتہذیب کو رد کر دینا چاہیے تو مطالعہ مغرب کے بعد ہی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے قارئین سے اور اس ملک کے عوام

وخواص سے، خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں اور علماء کرام سے، یہی تقاضا کرتے ہیں کہ وہ پہلے مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ کریں، اسے سمجھیں اور پھر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔ اس میں ہمارے رول ماڈل امام غزالیؒ ہیں جنہوں نے اپنے زمانے میں مسلمانوں پر یونانی علم وفکر کے منفی اور تباہ کن اثرات ملاحظہ کیے تو پہلے یونانی فکر وفلسفہ کا مطالعہ کیا، اسے سمجھا اور اس کے بارے میں اپنی کتاب 'مقاصد الفلاسفہ' لکھی۔ اور پھر اس مطالعہ اور تفہیم کے بعد انہوں نے اس کا ردّ اپنی کتاب 'تہافۃ الفلاسفۃ' میں لکھا اور مخالفین کے طرزِ استدلال کو استعمال کرتے ہوئے اسے ردّ کیا۔ قرآن حکیم بھی ہمیں یہی بات سکھاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ''[الانفال ۸:۴۲]

یعنی جب رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ پر حق واضح کردیا اور انہوں نے اسے ردّ کردیا تو اللہ تعالیٰ نے میدان بدر سجادیا تاکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کس فریق کو حاصل ہے اور حق کس فریق کے ساتھ ہے تاکہ جو مرے وہ بھی اپنی اصلیت جان لے اور جو زندہ وباقی رہے اس پر بھی اس کے موقف کا صحیح اور واضح ہونا مبرہن ہوجائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں یوم غزوۂ بدر کو ''یوم الفرقان'' قرار دیا کہ اس تصادم کے نتیجے میں دلیل کی بنیاد پر اس دن حق وباطل میں فرق واضح ہوگیا، حق نکھر کر سامنے آگیا اور باطل کا باطل ہونا اور نصرت الٰہی سے محروم ہونا باطل کی شکست اور حق کی فتح سے عیاں ہوگیا۔

۲۔ لیکن قارئین کرام یہ ذہن میں رکھیں کہ مطالعۂ مغرب کے لیے آپ کو خصوصی کوشش کرنی پڑے گی کیونکہ یہ ہماری نالائقی اور بدقسمتی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم مطالعۂ مغرب کے اہتمام سے عاری ہے۔ ہمارے جدید نظام تعلیم یعنی سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مغربی فکر وتہذیب کے تفہیمی وتنقیدی مطالعہ کا اہتمام موجود نہیں اور اسی طرح ہمارے دینی

مدارس میں بھی مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ ان کے نصابات اور اسکیم آف سٹڈیز کا حصہ نہیں۔
جدید تعلیم کے حوالے سے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ وہ اصولی طور پر لارڈ میکالے کے فلسفے کے تحت قائم شدہ علی گڑھ کے رول ماڈل ہی کا تسلسل ہے اور مغرب زدہ اور مغرب سے مرعوبیت پر مبنی ہے لہٰذا اس میں مغرب کا تنقیدی مطالعہ کیوں کر ہوگا؟ بلکہ وہ تو مغربی فکر وتہذیب کا نقیب اور علمبردار ہے، اس کے گن گاتا ہے اور اسے اپنانے کے دلائل دیتا ہے۔ نا قابل فہم موقف، البتہ ہمارے دینی مدارس کا ہے کیونکہ جن بزرگوں نے دیوبند کا رول ماڈل مدرسہ قائم کیا تھا وہ استعمار مخالف تھے، انگریز کے دشمن تھے اور اس سے نفرت کرتے تھے۔ انہیں تو چاہیے تھا کہ مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ جزو نصاب بناتے تاکہ ان کے طلبہ اس تہذیب کی حقیقت سے اور اس کے شرک والحاد سے باخبر ہوجاتے اور دلائل کی بنیاد پر اسے ردّ کرنے کے اہل ہوتے اور مسلمانوں کی آئندہ آنے والی نسلیں مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار ممالک کے دجل وفریب اور ان کی اسلام اور مسلم دشمنی سے باخبر ہوجاتیں اور ان کے زہر سے بچ نکلنے کا اہتمام کرپاتیں....لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں دیوبند کے رول ماڈل کی پیروی میں بننے والے ہزاروں دینی مدارس میں سے کسی ایک میں بھی مغربی فکر وتہذیب کے تنقیدی مطالعے کا اہتمام موجود نہیں۔

۳۔ یہ روش واضح طور پر زندہ قوموں کے مسلک کے خلاف ہے۔ خود مغربی استعمار ہی کو دیکھ لیجیے۔ انہوں نے جب مسلم ممالک پر قبضہ کیا تو اوری اینٹلزم (Orientalism) یعنی 'مطالعۂ شرق' یا استشراق کے نام سے پورا ایک اکیڈیمک ڈسپلن یا علم وجود میں لایا گیا جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلم علاقوں کے دین، اخلاقی اصول واقدار، رسوم ورواج، سوچ وفکر، اور معاشی، سیاسی اور معاشرتی رویوں کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا جائے تاکہ یورپی حکمرانوں کو محکوموں کے بارے میں مکمل معلومات مل جائیں اور وہ ان کو تادیر اپنا غلام اور گماشتہ بنائے رکھنے کے لیے موزوں پالیسیاں وضع کرسکیں۔ استشراق کا شعبہ اور کام اب بھی مغرب میں جاری وساری ہے صرف اس کا نام اہل مغرب نے وقت اور حالات کے مطابق بدل لیا ہے اور اب اسے وہ

ایریا سٹڈی سنٹرز' اور 'مطالعۂ اسلامی تہذیب' وغیرہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

۴۔ مسلمان اس وقت تاریخ کے جس دوراہے پر کھڑے ہیں یعنی ایک طرف وہ اس زوال سے نکلنے کے لیے کوشاں ہیں جس نے انہیں عزت ووقار سے محروم اور اپنی شناخت کے بحران میں مبتلا کر دیا ہے تو دوسری طرف وہ اس راستے اور منہج کی تلاش میں ہیں جو انہیں نشأۃ ثانیہ کی منزل تک لے جائے تاکہ وہ اپنی عظمت گم گشتہ کو پاسکیں تو اس کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ ان داخلی عوامل کا مطالعہ کریں جو اس سانحے پر منتج ہوئے تو وہیں ناگزیر ہے کہ وہ ان خارجی عوامل کا بھی مطالعہ کریں جو اس حادثے کا سبب بنے۔ ان خارجی عوامل میں سرفہرست مغربی فکروتہذیب اور اس کے علمبردار ممالک کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حکمت عملی، لائحہ عمل، پلاننگ اور سازشیں ہیں جن کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ نہ مخالفین کی کوششوں کو ناکام بنا سکیں گے اور نہ ان کے حوالے سے صحیح طرزِ عمل اختیار کر سکیں گے۔

خلاصہ یہ کہ مغربی فکروتہذیب اور اس کے علمبردار ممالک کی فکر، رویوں اور مناہج (Strategies) کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے بہت ضروری ہے کہ اس کے بغیر ان کے معاشرے اور ریاست کا استحکام اور ترقی تو دور کی بات ہے، ان کی بقاء ہی خطرے میں ہے۔

۵۔ مطالعۂ مغرب کیسے کیا جائے؟

مطالعۂ مغرب میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جانا چاہیے:

i۔ مطالعہ وتحقیق کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جس موضوع پر تحقیق کی جارہی ہو اس کے بنیادی مآخذ سے استفادہ کیا جائے۔ اس لیے مناسب تو یہ ہے کہ ہمارے جو علماء کرام مغربی فکروتہذیب کو سمجھنا چاہتے ہیں اور اس پر علمی تنقید کر کے اس کو غلط اور اسلام کو سچا اور برتر ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ انگریزی سیکھیں، پڑھیں اور لکھیں۔ پھر مغربی فکروتہذیب کو اس کے اصل مآخذ سے پڑھیں، سمجھیں اور پھر اس کا ردّ کریں۔ لیکن جب تک اس بات کا چلن عام نہیں ہوتا، دینی مدارس میں انگریزی پڑھانے کا اور علماء کا انگریزی سیکھنے کا رجحان عام

نہیں ہوتا، اس وقت تک انگریزی مآخذ کے اُردو تراجم یا اُردو میں مغرب کی تفہیم وتنقید کے حوالے سے لکھی گئی طبع زاد کتب کا مطالعہ بھی مفید نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔

ii۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصابات میں مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ شامل کیا جائے۔ دینی مدارس کی تعلیم کی مختلف سطحوں پر بھی اسے شامل نصاب کیا جائے۔ اس کے لیے نصابی کتب مدون کی جائیں، اساتذہ کو اس مواد کی تدریس کے لیے ریفریشر کورسز کرائے جائیں اور ان کے لیے موزوں علمی مواد تیار کر کے انہیں مہیا کیا جائے۔

iii۔ علوم اسلامیہ میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات کے موضوعات کے تعین کے وقت مغربی فکر وتہذیب کے تفہیمی وتنقیدی مطالعے اور اس کے اسلامی فکر اور مسلم معاشرے پر اثرات اور مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار مغربی ممالک کے مسلمانوں کے خلاف رویے اور سازشوں پر تحقیق کو ترجیحاً اختیار کیا جائے اور پھر اس تحقیق کے نتائج کی وسیع پیمانے پر طباعت اور نشر واشاعت کا انتظام ہو تا کہ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں اور عامۃ الناس تک یہ کتابیں پہنچ سکیں۔ اس سے مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں عمومی آگاہی اور اس کے ردّ کی فضا پیدا ہوگی۔

iv۔ ہم نے ۱۹۸۸ء میں جب 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش' لکھی تھی تو اس وقت مطالعۂ مغربی فکر وتہذیب کے لیے ایک فہرست کتابیات مرتب کی تھی۔ حال ہی میں ہمارے فاضل دوست جامعہ کراچی کے سید خالد جامعی صاحب نے ایک تفصیلی فہرست کتابیات برائے مطالعہ مغربی فکر وتہذیب مرتب کی ہے۔ یہ دونوں فہرستیں ضمیمہ اوّل ودوم کے عنوان سے اس فصل کے آخر میں شامل ہیں، ان سے استفادہ کیا جائے۔

ضمیمہ اوّل

کتابیات۔ مغربی فکر وتہذیب

مرتبہ مصنف (۱۹۸۸ء)

۱۔ ول ڈیورانٹ، داستان فلسفہ (ترجمہ عابد علی عابد) فکشن ہاؤس، لاہور ۱۹۹۵ء

۲۔ ولیم جیمز اور ول ڈیورانٹ، نشاط فلسفہ (اردو ترجمہ محمد اجمل) فکشن ہاؤس، لاہور ۱۹۹۵ء

۳۔ سی جے کلیمنٹ، تاریخ فلسفہ (اردو ترجمہ مولوی احسان احمد) جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۹ء

۴۔ ہیرالڈ ہوفڈنگ، فلسفۂ جدید (ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم) جامعہ عثمانیہ، ۱۹۳۱ء

۵۔ ڈی ایس رابنسن، مقدمۂ فلسفۂ حاضرہ (ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین) اشاعت نو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۵ء

۶۔ سی ایم جوڈ، تعارف فلسفۂ جدید (اردو ترجمہ آشکار حسین)، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۵۶ء

۷۔ خواجہ غلام صادق، فلسفۂ جدید کے خدوخال، نگارشات، لاہور ۱۹۸۶ء

۸۔ پروفیسر سیموئیل ھنٹنگٹن، تہذیبوں کا تصادم (اردو ترجمہ و تلخیص) نگارشات، لاہور ۲۰۰۵ء

۹۔ پروفیسر سی اے قادر، فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان، مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی، لاہور ۱۹۸۱ء

۱۰۔ ڈاکٹر وحید عشرت، فلسفہ کیا ہے؟ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۷ء

۱۱۔ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۱۲۔ علی عباس جلالپوری، روایات فلسفہ، المثال، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۳۔ آلیور تھیچر و فرڈی ننڈ شیول، تاریخ یورپ (اردو ترجمہ عبدالماجد دریا آبادی و دیگر) تحقیقات لاہور ۲۰۰۳ء

۱۴۔ جان ولیم ڈریپر، معرکۂ مذہب وسائنس (اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں) انجمن اردو، حیدر آباد (دکن) س،ن

۱۵۔ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، مغربی تہذیب۔ ایک معاصرانہ تجزیہ، شیخ زاید اسلامک سنٹر،

جامعہ پنجاب، لاہور ۲۰۰۲ء
۱۶۔ محمد حسن عسکری، جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ، راولپنڈی ۱۹۷۹ء
۱۷۔ آغا افتخار حسین، فکر فرنگ، نفیس اکیڈمی، حیدر آباد، ۱۹۴۶ء
۱۸۔ ڈاکٹر رفیع الدین، قرآن اور علم جدید، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۵۲ء
۱۹۔ مولانا مودودی، تنقیحات، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۳ء
۲۰۔ مولانا امین احسن اصلاحی، فلسفے کے بنیادی مسائل۔قرآن حکیم کی روشنی میں، فاران فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۹۷ء
۲۱۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، یورپ پر اسلام کے احسان، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۵ء
۲۲۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برقی، اسلام اور عصر رواں، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س۔ن
۲۳۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برقی، الحاد مغرب اور ہم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۷۸ء
۲۴۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برقی، ہماری عظیم تہذیب، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۱ء
۲۵۔ مولانا وحید الدین خاں، اسلام عصر حاضر میں، المکتبہ الاشرفیہ، لاہور، س۔ن
۲۶۔ سید قطب، ساجد الرحمن صدیقی، اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، ادارہ معارف اسلامی، کراچی ۱۹۷۳ء
۲۷۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء
۲۸۔ سید ابو الحسن علی ندوی، مسلم معاشرے میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء
۲۹۔ ڈاکٹر محمد امین، مسلم نشأۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل، کتاب سرائے اردو بازار، لاہور ۲۰۰۴ء
۳۰۔ ڈاکٹر محمد امین، اسلام اور تزکیۂ نفس ۔مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۴ء

۳۱۔ پروفیسر ربّ نواز، اسلامی کلچر اور اس کا مادی وروحانی کلچر سے تقابلی جائزہ، حجاز پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء
۳۲۔ ڈاکٹر احسان محمد خان، مشرقی ومغربی تہذیب، اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی ۱۹۶۲ء
۳۳۔ سید اقبال احمد جونپوری، قوموں کا عروج وزوال۔ مذاہب کی روشنی میں، شیراز پبلشنگ ہاؤس، جونپور، بھارت ۱۹۶۲ء
۳۴۔ پروفیسر عبدالحمید صدیقی، انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام، اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۳۶ء
۳۵۔ محمد قطب، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور
۳۶۔ محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار (اردو ترجمہ سجاد احمد) مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۹۰ء
۳۷۔ محمد قطب، جدید جاہلیت (اردو ترجمہ ساجد الرحمن صدیقی) اسلامک بک پبلشرز، کویت ۱۹۷۶ء
۳۸۔ ڈاکٹر محمد مظہر الدین صدیقی، ہیگل، مارکس اور اسلامی نظام، پٹھان کوٹ ۱۹۴۳ء
۳۹۔ ڈاکٹر محمد مظہر الدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۶ء
۴۰۔ قاری محمد طیب، اسلام اور مغربی تہذیب، ادارہ تاج المعارف، دیوبند ۱۹۵۸ء
۴۱۔ محمد ارشد خان بھٹی، مطالعۂ تہذیب اسلامی، بک ورلڈ، لاہور، س۔ن
۴۲۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (اردو ترجمہ سید نذیر نیازی)، کاروان پریس، لاہور ۱۹۵۸ء
۴۳۔ جسٹس محمد منیر، اسلام اور تہذیب حاضرہ، لاء پبلشنگ کمپنی، لاہور، س۔ن
۴۴۔ ظفر تاباں، مقابلۂ اسلام ویورپ، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۲۷ء

۴۵۔ مولانا تقی امینی، لامذہبی دوکا تاریخی پس منظر، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۵ء
۴۶۔ قاضی جاوید، معاصر مغربی فلاسفہ، نگارشات، لاہور، س۔ن
۴۷۔ پال فنڈلے، امریکہ کی اسلام دشمنی، نگارشات، لاہور ۲۰۰۳ء
۴۸۔ مسرت کریم، معاشرے پر مغربی تہذیب کے مضر اثرات (تھیسز ایم اے، شعبہ علوم اسلامیہ) جامعہ پنجاب ۱۹۸۷ء
۴۹۔ سید حسین نصر، جدید دنیا میں روایتی اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۶ء
۵۰۔ راجہ عبدالرحمن، جدید تہذیب اور اسلام کی روشنی، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور ۱۹۹۵ء
۵۱۔ پروفیسر عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت (ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی) ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۷ء
۵۲۔ خالد جامعی و عمر حمید ہاشمی، جریدہ ۲۹، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی ۲۰۰۴ء
۵۳۔ ماہنامہ ساحل، کراچی (اکثر شمارے)

انگریزی کتابیات

1. G.R.Elton, *Renaissance and Reformation,* 1300-1648, The Mecmillan Co. New York, 1968.
2. Kurts Paul, Forbidden Fruit: The Ethics of Humanism (Tr. Philip Mairet). Routledge, London, 1992.
3. Summervile John, The Secularization of Early Modern England, Oxford University Press, 1992.
4. W.F. Reddawa, *A history of Europe from 1161 to 1715*, Methven & Co. Ltd. London, 1959.
5. A. j. Grant & H. Temperley, *Europe in the 19th & 20th Centuries (1798-1938),* Longmans. Green & Co. London, 1939.
6. T.K. Derry & T.L. Jarman, *The European World (1870-1961)*, G. Bell & Sons Ltd. London, 1968.

7. S.E. Frost, *The Basic Teachings of Great Philosophers,* New Home Library, 1942.
8. Well Durant, *The Story of Philosophy,* Ernest Benn, 1947.
9. Eugene G. Bewkes & Others, *The Western Heritage of Faith and Resaon,* Harper & Row Publishers, London 1963.
10. Carlton, J. H. Hayes, A *Political & Cultural History of Europe,* 2Vols, The Macmillan Co. New York. 1935.
11. Sterling P. Luprecht. *Our Philosophical Traditions,* Appleton-Century-Crofts Inc. New York, 1955.
12. Andrew Cheywood, *Political Ideas and Concepts – An Intoduction,* McMillan, Hampshire, 1994.
13. Dobxhausky, Theodozus, *Mankind Evolving,* Vales University press, 1962.
14. F. Copleston, *A History of Philosophy,* Image Books, New York, 1961.
15. Draper, J.K. *A History of the Intellectual Development of Europe,* London, 1891.
16. Paul Fundley, *Silent No More: Confionting America-s False Images of Islam,* New York, 2004.
17. Noam Chomsky, *The New Military Humanism,* London, 1999,
18. John L. Esposito, *The Islamic Threat: Myth or Reality!* London, 1995.
19. John L. Esposito, World Religions Today, Oxford University Press, 2002
20. Ernest Gellener, *Postmodernism, Reason and Religion,* New York, 1992.
21. Emest Gellener, *Islamic Dilemmas, Reforms, Nationalists*

and Industrialists, Walter de Gruyter, 1985.
22. Bernard Lewis, *Crises of Islam: The Holy War and Unholy Terror,* Oxford University Press, 2002
23. Martin Kramer, *Arab Awakening and Islamic Revival, Transaction Publishers,* New Jersey, 1996.
24. Morvin E. Gettleman and Stuart Schear, *The Middle East and Islamic World Reorder,* Grove Press, 841Broadway New York, 2003.
25. S.N. Eisenstadl, *Fundamentalism, Secretarianism and Revolutions,* Cambridge University Press, 1999.
26. Ceasar E. Farah, *Islam,* Barran's Educational! Sciences Inc. New York,.2003.
27. Karen Armstrong, *Muhammad:A Western Attempt to Understand Islam,* Victor Hollancz, London, 1992.
28. Cragg Kenneth, *Call of Minaret,* Oxford University Press, New Yrok, 1956.
29. Morman Daniel, Islam and the West: The Making of an Image, Oxford, 1960.
30. Albert Hourani, Western Attitudes towards Islam., Univesity of South Hampton,1974.
31_Albert Hourani/slam in European Thought, Cambridge University8 Press, 1989.
32_R.W. Southern, Western Views of Islam in Middle Ages, Harvard University Press, 1962.
33_Montgomery Watt, Islamic Fundamentalism and, Modernity, Ken Paul, London, 1988.
34_Will Wagner, How Islam Plans to Change the World, Kregel Publication, USA 2004.

35-Barry Rubin, Revolutioneries and Reforms:
Contemporary: Islamist Movements in the Middle East,
Univerity of Ne' Yorl Press, 2003
'36-Ziauddin Sardar, The Furure of Muslim Civilzation,7
Groom Helm, London, 1979.
37-Ziauddin Sardar, Islamic Futures, Peland Publications,
Malaysia, 1988.
38-Muhammad Asad, Islam at the Cross Road, Sh.
Muhammad Ashraf, Lahore, 1985.
39-Fazlur Rehman, Jslam und Modernity: Transformation of
an Intellectual Tradition, Chicago, 1982.
40-Anwar Ibrahim, The Asian Renaissance, Kuala Lumpur,
1996.
41-Akbar S. AhmadHastings Donnan(Eds/※(.s/am,
Globalization and Postmodernity, London, 1994.
42. Akbar S. Ahmad, Postmodernism and Islam:
Predicament and Promise, London, 1992.
43-Iftikhar H. Malik, Islam, Globalisation and Modernity,
Vanguard. Lahore, 2004.

ضمیمہ دوم

کتابیات۔مغربی فکر و تہذیب

مرتبہ سید خالد جامعی (۲۰۱۷ء)

(۱) تھافۃ الفلاسفۃ: از امام غزالیؒ (م ۱۱۱۱۔۱۰۵۸ء) یہ اسلامی اور مذہبی فکر

کے تصادم کے بارے میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی کتاب ہے۔کلاسیکی یونانی فلسفہ تراجم کے ذریعے مسلم مفکرین پر گہرے اثرات مرتب کررہا تھا۔تہافتہ الفلاسفۃ میں فارابی اور ابن سینا کے فلسفوں اوران کی فکر کے بنیادی نکات کا جواب دیا گیا ہے۔غزالی نے یونان کے زیراثر مسلم فلسفیوں کی فکر کو ۲۰ بنیادی مسائل میں ڈھالا اوران کا جواب لکھا۔

(۲) تھافۃ التھافہ: از ابن رشد(۱۱۹۸۔۱۱۲۶ء) یہ کتاب امام غزالیؒ کی تہافتہ الفلاسفہ کا جواب ہے،(یہ کتاب امام غزالیؒ کے انتقال کے بعد شائع ہوئی)۔تہذیبی فکر کے تصادم سے دلچسپی رکھنے والے اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ یونانی فکر کا حملہ کتنا شدید تھا اورامام غزالیؒ نے تہافتہ میں اس کا کیا جواب دیا اور تہافتہ پر تنقید کرنے والوں نے غزالیؒ پر کیا نقد فرمایا؟اس نقد کی سطح کیا تھی؟ یہ کتاب امام غزالی کے فکر پر تمام نقد کا احاطہ کرتی ہے،اس لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

(۳)الرد علی المنطقیین: از علامہ ابن تیمیہؒ،اس کتاب میں امام ابن تیمیہؒ نے یونانی فکر کے مسلم فکر پر اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے،مسلم مفکرین کے یہاں یونانی اثرات کی نشاندہی کی ہے اور یونانی فکر کا رد کیا ہے۔

(۴) مکتوبات امام ربانی: کامل از مجدد الف ثانیؒ۔ یہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ان مکتوبات میں اسلامی عقائد کا بیان ہے اور کئی خطوط میں اسلامی اور غیر اسلامی عقائد کے امتیازات اور اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیبوں کی عدم مطابقت کے بنیادی امور بیان کیے گئے ہیں۔

(۵)الرسالۃ الحمیدیۃ: ازشیخ آفندی

(۶)الانتباہات المفیدہ فی الاشتباہات الجدیدہ: از حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔اس کا انگریزی ترجمہ محمد حسن عسکری نے An Answer to Modernism کے نام سے کیا ہے۔

(۷) عقلیات اسلام: از مولانا مصطفی خان بجنوری۔ یہ کتاب الانتباہات کی تسہیل و تشریح ہے۔ اصل رسالہ ۷۰ صفحات کا ہے اور تشریح چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالہ انتباہات کی تسہیل و تشریح نہایت عمدہ طریقے سے کی گئی ہے اور عقل و منطق کی نارسائیاں نہایت عمدہ دلیلوں سے واضح کی گئی ہیں۔ انداز بیان سادہ اور دل نشین ہے، اگر اس کتاب کو غور سے پڑھا جائے تو سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے غبار سے چندھیانے والی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ عرصہ سے اس کتاب کی اعلیٰ طباعت پر کسی نے خاص توجہ نہیں دی تھی البتہ اب مکتبۃ البشریٰ کراچی نے اعلیٰ طباعت سے آراستہ کر کے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

(۸) الکلمۃ الملھمۃ: از اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلویؒ

(۹) کلیات اکبر الہ آبادیؒ: اکبر الہ آبادی ہمارے عظیم ترین شاعروں میں سے ہیں۔ تہذیبوں کے تصادم کے ابتدائی مراحل دیکھنے ہوں تو اکبر کی شاعری پڑھنا ناگزیر ہے، اکبر کی عظمت یہ ہے کہ اقبالؒ تک ان کے زیر اثر رہے ہیں۔ اکبر کی تخلیقی سطح اقبال کے ہم پلہ ہے، فرق یہ ہے کہ اکبر نے جو بات طنز و مزاح کے پیرائے میں کہی ہے اقبال اسے ایک بڑے فکری کینوس میں اعلیٰ ترین سنجیدہ سطح پر بیان کرتے ہیں۔ کلیات اکبر الہ آبادی کے مطالعے کی تجویز ممکن ہے بعض طبائع پر گراں گزرے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ اکبر الہ آبادی نے طنزیہ شاعری کے ذریعے تہذیب و فلسفہ مغرب کے خلاف بند باندھنے کی کتنی زبردست کوشش کی۔ ان کے اس کام کی اہمیت شاعر مشرق پر خوب روشن تھی اسی لئے علامہ اقبالؒ اپنے خطوط میں حضرت اکبرؒ کو اپنا پیر قرار دیتے، ان کا شرف نیاز حاصل کرنا چاہتے اور اپنا دل حضرت اکبرؒ کے سامنے چیر کر رکھنا چاہتے تھے اقبال خود کو لاہور میں تنہا سمجھتے اور حضرت اکبرؒ کو وہ فرد واحد جانتے جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔ وہ اکبر سے طویل خط لکھنے کی استدعا کرتے اور اس خواہش کو روحانی خود غرضی

قرار دیتے۔ وہ حضرت اکبرؒ کو پیر مشرق قرار دیتے تھے۔ حضرت اکبر کے بارے میں اقبال نے یہاں تک لکھا کہ ''اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا قطعاً رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ خط و کتابت سے پہلے آپ سے جو ارادت وعقیدت تھی ویسی اب بھی ہے اور انشاء اللہ جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی''، اقبال نے چند اشعار حضرت اکبر کے رنگ میں بھی لکھے مگر عوام کی بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ سے کچھ سمجھ لیا۔ اقبال کے خیال میں حضرت اکبر نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ (شعر) میں بند کر دیا تھا واضح رہے کہ اقبال ہیگل کو بہ اعتبار تخیل افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے تھے حضرت اکبر کے خطوط سے اقبال پر غور و فکر کی راہیں کھلتیں اس لئے اکبر کے خطوط وہ محفوظ رکھتے۔ حضرت اکبر کے اشعار پڑھ کر اقبال کو شیکسپئر اور مولانا روم یاد آ جاتے تھے اقبال شکوہ جواب شکوہ پر دس پندرہ سطور کا دیباچہ ناشر کے مطالبے پر حضرت اکبر سے لکھوانے کے خواہش مند تھے۔ (اقبال نامہ، ص ۲۷۳، ۳۷۴، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۹۳، ۳۹۷ یک جلدی تصحیح وترمیم شدہ، اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۵)۔ علامہ اقبالؒ کے اِن افکار سے ''کلیات اکبر الٰہ آبادی'' کی اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

(۱۰) اقبالؒ کی ساری اردو اور فارسی شاعری اور کم از کم ضربِ کلیم جو اس اعلان کے ساتھ شائع ہوئی ''ضربِ کلیم یعنی اعلان جنگ دورِ حاضر کے خلاف''۔ خطبات اقبال سے اقبال نے رجوع کر لیا تھا لہٰذا وہ اس میں شامل نہیں۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندویؒ کے افکار جو خطبات پر عالمانہ نقد ہیں، جریدہ شمارہ ۳۳ میں امالی غلام محمد کے نام سے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

(۱۱) اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی: از مولانا مودودیؒ

(۱۲) انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل: از مولانا مودودیؒ

(۱۳) تفہیمات: از مولانا مودودیؒ

(۱۴) تنقیحات: از مولانا مودودیؒ

(۱۵) الجہاد فی الاسلام۔: از مولانا مودودیؒ

(۱۶) رسائل و مسائل پانچ حصے: از مولانا مودودی۔ ان میں عہد حاضر کے متکلمانہ مسائل کا انتخاب نظر آئے گا اور جدید ذہن کے شبہات سامنے آئیں گے۔

(۱۷) مغربی فکر و فلسفے کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، خطبات لاہور: ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

18 A Cas Against Capitalism:Dr Javaid Akber Ansari

19 Buisness Ethices in Pakistan:Dr Javaid Akber Ansari

20 Money and Banking in Pakistan:Dr Javaid Akber Ansari

21 Financial Menagement in Pakistan:Dr Javaid Akber Ansari

(۲۲) قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل: از ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔ اس کتاب کا آخری باب جدید اسلامی فکر میں اقبال کی اہمیت ص ۲۱۵ تا ۲۹۲ پر محیط ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا انگریزی میں غیر مطبوعہ مقالہ Iqbal's Reconstruction بھی اہمیت کا حامل ہے، فاروقی صاحب کے شاگرد خضر یاسین کی تحقیق کے مطابق خطبات پر سید سلیمان ندوی کی تنقید اور برہان فاروقی کی غیر مطبوعہ انگریزی کتاب کے الفاظ، خیالات اور افکار میں غیر معمولی توارد ہے۔ اس سلسلے میں جریدہ ۳۴ اور اقبال اکادمی کی کتاب ''میار ابزم بر ساحل کہ آنجا'' کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

(۲۳) خطبات اقبال نئے تناظر میں: از محمد سہیل عمر، علامہ اقبال کے خطبات ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کا پہلا فلسفیانہ ناقدانہ جائزہ ہے۔ اس کتاب کے ذریعے فکر و فلسفہ و تہذیب مغرب کے پیدا کردہ الحاد شکوک، شبہات، سوالات اعتراضات اور توہمات کی مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ عہد جدید کے اذہان میں پیدا شدہ ان سوالات کا جواب عقلیات کی روشنی میں دینے کی کوشش مختلف مفکرین اور متجددین نے کی ہے، اس کا ناقدانہ جائزہ بھی

سامنے آتا ہے۔ سہیل عمر نے اس کتاب کو برہان احمد فاروقی صاحب کے امالی قرار دیا ہے، جبکہ یہ محض اظہار عجز ہے اور سہیل عمر کی سعادت مندی اور احسان شناسی۔

(24) History of Islamic Philosophy: Dr Syed Hossein Nasr

حسین نصر کی تمام کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی فکر سے ہمیں اختلاف ہے، لیکن ان میں بہت اہم نکتے ملتے ہیں۔

(۲۵) خطبات اقبال۔ ایک مطالعہ: ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ علوم اسلامی کی باقاعدہ تحصیل اور عربی زبان پر عبور کے بغیر اجتہاد اور روشن خیال افکار پیش کرنے کے دعوے دار کس قدر غلطیاں کرتے ہیں اور قدم قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔

(۲۶) قرآن اور علم جدید: ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر صاحب کی دیگر کتابوں میں بھی کام کے نکتے ملتے ہیں۔

(۲۷) مائیکل مین کی معرکہ آراء کتاب *The Dark Side of Democracy* یہ کتاب جمہوریت کے اصل چہرے سے نقاب الٹتی ہے اور تاریخی اعداد و شمار سے ثابت کرتی ہے کہ جمہوریت جہاں بھی گئی قتل و غارت گری لے کر گئی اور بیسویں صدی دنیا کی خوں خوار ترین صدی تھی۔ مائیکل مین نے اعداد و شمار اور حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ پر امن مذہب ہے اور اس کی تاریخ اجلی تاریخ ہے۔ جمہوریت کے تمام مداحوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے، اگر مداحان جمہوریت کی نظر سے یہ کتاب گزر جائے تو شاید وہ جمہوریت ترک کر دیں، جمہوریت نے جس طرح خوں ریزی کی اور ایک ارب انسانوں کا قتل عام کیا، ہمارے اکثر دانشور اس کی تاریخ سے ناواقف ہیں۔

(۲۸) مریم جمیلہ صاحبہ کی تمام کتابیں خصوصاً 'اسلام ایک نظریہ ایک تحریک' اور *Islam and Modrenism*۔ مریم جمیلہ صاحبہ کے وہ تمام تبصرے جو مختلف کتابوں پر

وہ Muslim World Book Review میں سالہا سال تک کرتی رہیں۔

(۲۹) جدیدیت: یعنی مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ از محمد حسن عسکری۔

(۳۰) وقت کی راگنی: از محمد حسن عسکری

'جدیدیت' مغربی فکر کے زوال اور اس کے ہولناک اثرات کی مختصر ترین تاریخ ہے جبکہ وقت کی راگنی ہمیں بتاتی ہے کہ اردو ادب کی روایت کیا ہے اور وہ مغربی روایت سے کتنی مختلف ہے۔ محمد حسن عسکری کے مندرجہ ذیل مضامین و انٹرویو وغیرہ کا مطالعہ بھی از حد مفید رہے گا۔

☆ مذہبی شاعری، یہ گفتگو لفظ میں شائع ہوئی تھی ☆ محراب اور سات رنگ میں عسکری صاحب کے شائع شدہ مضامین ☆ محسن کاکوروی کی نعت ☆ پیروی مغرب کا انجام ☆ اردو کی ادبی روایت کیا ہے ☆ بارے آموں کا کچھ بیان ہو جائے ☆ جزیرے کا دیباچہ ☆ روح کی تلاش ☆ ادب میں اخلاقی مطابقت ☆ ہمارا ادبی شعور اور مسلمان ☆ اسلامی فن تعمیر کی روح ☆ مغرب میں مسلمانوں کا تبلیغی وجود ☆ مکاتیب عسکری مرتبہ شیما مجید ☆ مضامین عسکری شیما مجید ☆ مشرق و مغرب کی آویزش اردو ادب میں ☆ شب خون میں احمد جاوید اور آصف فرخی کا مکالمہ نیز شب خون البلاغ میں عسکری کے مضامین۔

(۳۱) نئی نظم اور پورا آدمی: از سلیم احمد

(۳۲) مشرق ہار گیا از سلیم احمد

نئی نظم اور پورا آدمی اردو تنقید کی نہایت ہنگامہ خیز اور اہم کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ مغربی فکر کے زیر اثر ہمارے ادب سے کس طرح پورے آدمی یا Whole Man کا بیان تحلیل ہوا اور اس کی جگہ ادھورے آدمی کا بیان در آیا۔ سراج منیر نے سلیم احمد کے تصور کو مابعد الطبیعیاتی سطح کا نظریہ قرار دیا ہے۔

'مشرق ہار گیا' سلیم احمد کی ایک طویل نظم ہے جس میں مغربی فکر کے زیر اثر مسلم

معاشروں میں اقدار کی شکست وریخت اور علامتوں کی تبدیلی کو بیان کیا گیا ہے۔

(۳۳) معرکہ مذہب وسائنس: ترجمہ مولانا ظفر علی خان

(۳۴) سائنس اور مذہب: عبدالباری ندوی

(۳۵) صدق اور صدق جدید: مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کے تمام رسالے، ہر رسالے میں کوئی نہ کوئی نکتہ مل جاتا ہے جس سے مغربی فکر و فلسفے کی تردید ہوتی ہے۔

(۳۶) : M M Sharif A History of Muslim Philosophy

(۳۷) عالم اسلام دجالی تہذیب کی زد میں، عبدالماجد دریا آبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

(۳۸) ملت اسلامیہ اور عصر حاضر کے تقاضے، عبدالماجد دریا آبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

(۳۹) اسلام مسلمان اور تہذیب جدید، عبدالماجد دریا آبادی: مرتب حافظ محمد موسیٰ بھٹو

(۴۰) بیسویں صدی کے اسلامیت کے ممتاز شارحین، محمد موسیٰ بھٹو

(۴۱) تعلیمات مجدد الف ثانیؒ، محمد موسیٰ بھٹو

حافظ محمد موسیٰ بھٹو ماہنامہ بیداری بھی شائع کرتے ہیں۔ یہ رسالہ مختلف النوع مضامین کا گلدستہ ہے۔ اس میں مغرب، فکر مغرب، فلسفۂ مغرب پر شائع شدہ مضامین کتب تقاریر کا خوبصورت انتخاب پیش کیا جاتا ہے (بعض مضامین جدیدیت کی تائید بھی کرتے ہیں کیونکہ مضمون نگار علماء اور مفکر مغربی فکر و فلسفے سے واقف نہیں ہوتے لہٰذا سادہ لوحی کے باعث اخلاص سے مغرب اور جدیدیت کے بعض مظاہر کی اسلامی توثیق کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسا شاذ ہوتا ہے)

(۴۲) سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت: از ڈاکٹر ظفر الحسن۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں سرسید احمد خان اور مولانا حالی نے کس طرح مغربی تہذیب کی اصطلاح Nature کو غلط سمجھا اور اس کا اطلاق ادب کے ساتھ اسلام پر بھی کر ڈالا جس کے تباہ کن فکری نتائج برآمد ہوئے۔ یہ کتاب بتاتی ہے کہ لفظ ''نیچر'' عیسائی، ہندو، جدید مغربی تہذیب

اور اسلامی تہذیب میں کن کن معنوں میں استعمال ہوا اور ان معنوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس موضوع پر اس سے زیادہ اچھی کتاب شاید ہی کبھی لکھی گئی ہو۔

(۴۳) افکار سرسید: از ضیاء الدین لاہوری

(۴۴) حیات سرسید: از ضیاء الدین لاہوری

(۴۵) نقش سرسید: از ضیاء الدین لاہوری

یہ کتابیں ضیاء الدین لاہوری صاحب کی چالیس سالہ تحقیقی کاوشوں کا حاصل ہیں ان کتابوں میں مصنف نے موضوعات کے اعتبار سے سرسید کی فکر کو ان کی اصل تحریروں سے اقتباسات کی صورت میں جمع کر دیا ہے اور اس کتاب میں سرسید کی فکر کا نچوڑ سمٹ آیا ہے۔ واضح رہے کہ برعظیم پاک و ہند میں جدیدیت کے بانی سرسید ہیں (گوکہ اس کا آغاز کرامت علی جونپوری سے ہوا) لہٰذا سرسید کی فکر کو اس کے سیاق وسباق بلکہ سرسید کے اصل الفاظ میں پڑھنا نہایت ضروری ہے۔ سرسید کے خیالات کا اپنے عہد کے بڑے بڑے لوگوں پر اثر تھا۔ نامی گرامی اشخاص سرسید کے اثرات سے بچ نہ سکے اور ان کے افکار میں جدیدیت کا زہر سرسید کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ اس وقت سرسید کی تمام تحریریں ان بزرگوں کے سامنے نہیں تھیں، خصوصاً سرسید کا وہ خط جس میں وہ قرآن کو کلام اللہ نہیں بلکہ کلام رسول اللہ قرار دیتے ہیں۔ یہ جرأت اسلامی تاریخ میں خوارج، معتزلہ اور کسی گمراہ فرقے کو بھی نہ ہوئی۔ اگر یہ خط ان اکابرین کے سامنے ہوتا تو وہ سرسید کو رد کر دیتے۔

(۴۶) ایران سے شائع ہونے والا رسالہ [ThoughtEcho of Islam] سہ ماہی، مدیر محمد سلیمی

(۴۷) The Decline of the West by Oswald Spengler

مغربی تہذیب کے بارے میں اس کتاب کا شمار مغربی ادب کے کلاسک میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب پہلی جنگ عظیم سے قبل لکھ لی گئی تھی مگر شائع ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ یہ کتاب مغربی

تہذیب کی بنیادوں، کلاسیکی یونانی فکر اور مغربی تہذیب کے مرحلہ بہ مرحلہ زوال کو بیان کرتی ہے۔ اسے پڑھے بغیر مغربی فکر کے بحران کا اندازہ دشوار ہے۔ اس کا ترجمہ 'زوال مغرب' کے نام سے اکادمی ادبیات شائع کر چکی ہے۔

(۴۸) رینے گینوں کی تین اہم کتابیں:

[A] The Reign of the Quantity,
[B]Crisis of the Modern World,
[C] East and West

رینے اسلام لانے کے بعد شیخ عبدالواحد عیسیٰ کہلائے۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے قبل رینے کے فکر کا جائزہ جریدہ ۳۵ میں ملاحظہ کیجیے کیونکہ روایت کا مکتبہ فکر وحدت ادیان کی گمراہی کا مبلغ ہے۔ احمد جاوید اور تحسین فراقی نے لاہور میں مارٹن لنگز سے براہ راست پوچھا کہ آپ روایت کی جو بات کرتے ہیں تو کیا اس کا مطلب یہی ہے کہ تمام مذاہب برحق ہیں اور کوئی الحق نہیں تو مارٹن لنگز نے برجستہ جواب دیا جی ہاں آپ بالکل درست سمجھے ہیں (یہ روایت تحسین فراقی صاحب نے سید خالد جامعی سے خود بیان کی)

(۴۹) رینے کے معاصر آنند کمار سوامی کی دو کتابیں:

[A] Figure of Speech or Figure of Thought, [B] What is Civilization?

دوسری کتاب بتاتی ہے کہ مذہبی تہذیبوں میں لفظ تہذیب کے کیا معنی رہے ہیں اور جدید مغربی تہذیب اسے کس مفہوم میں استعمال کرتی ہے، پہلی کتاب ثابت کرتی ہے۔ کہ جدید مغربی فکر آرٹ اور تخلیق کے تصور کو پست سے پست تر کر کے اس سطح پر لے آتی ہے جہاں انسان، حیوان اور پودوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔

(۵۰) شواں کی درج ذیل کتابیں: شواں کا تعلق بھی روایت کے گمراہ مکتب فکر سے ہے۔

[A] DIMENSIONS OF ISLAM.

[B] TO HAVE A CENTER.

[C] FORGOTTEN TRUTH

فکرمغرب کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ لازمی ہے۔

[1]	Judaism and Rise of Capitalism	ZAMBAT
[2]	Sources of Self	Charles Taylor
[3]	I & Thou	Martin Boober
[4]	Being and Nothingnes	Sarter
[5]	Capitalism Shezophrenic life style Anti Edipus [Volume I] Anti Platious [Volume II]	Dlues
[6]	Madness & Civilization	Focualt
[7]	Discipline and punishment	Focualt
[8]	History of Sexuality [Three Volumes]	Focualt
[9]	The Archiology of Knowledge	Focualt
[10]	The Birth of Clinic	Focualt
[11]	Contigency Irony and solidarity	Richard Rorty
[12]	Achieving our country	Richard Rorty
[13]	Objectivity Vol. I & II	Richard Rorty
[14]	Post Structuralism and Post modernism	Madhan Surup
[15]	Enlightenment Wake	John Gray.
[16]	History of Muslim Thought	Majid Fakhri
[17]	Philosophy and Islam	M. Watt
[18]	Islam	A. R Gibbs
[19]	Platuo	A.E. Taijlor
[20]	An introduction of Greek Thoghts	Guttehery
[21]	An introduction of Greek Thoughts	STAC
[22]	The Classics of westren philosophy [one volume.]	
[23]	Being & Existence	

Broke کی اس کتاب کا دیباچہ ہائیڈیگر نے لکھا ہے، یہ کتاب *Time Being* کی شرح ہے اور اتنی عمدہ شرح کہ ہائیڈیگر نے دیباچے میں لکھا کہ میرے خیال کے قریب کتاب ہے۔

مغربی مصنفین و مفکرین کی درج ذیل کتابوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے:

[1] *BEYOND THE POSTMODERN MIND* BY HUSTON SMITH.

[2] *THE RISE AND FALL OF THE GREAT POWERS*. BY PAUL KENNEDY.

[3] *THE END OF THE HISTORY AND THE LAST MAN* BY FUKUYAMA.

[4] *THE WORLD IN COLLISION* EDITED BY KEN BOOTH AND TIM DUNNE.

[5] *HOLY WAR* BY KAREN ARMS STRONG.

[6]THE ANATOMY OF HUMAN DESTRUCTIVENESS BY ERIC FROMM.

[7] *MUSLIMS AND THE WEST*. EDITORS ANSARI ZAFAR ISHAQ AND JOHN ESPOSITO.

فکر و فلسفہ و تہذیب مغرب کا رعب عموماً سائنس و ٹیکنالوجی کے ذریعے بٹھایا جاتا ہے جدیدیت پسند مفکرین مغرب کی سائنس و ٹیکنالوجی سے بے حد مرعوب ہیں اور اس کا کوئی متبادل نہیں پاتے سوائے اس کے کہ عالم اسلام کسی بھی طریقے سے مغرب کی اس ترقی کو حاصل کرے ان مفکرین کو سائنس و ٹیکنالوجی کے مباحث سے متعلق درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تا کہ ان کا خلجان دور ہو سکے اور امت ان کے افکار کی اڑائی گئی گرد سے باہر نکل سکے، یہ کتابیں ان لوگوں کے لیے بھی مفید ہیں جو ابھی تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے سحر سے باہر نہیں آ سکے اور امت مسلمہ کی نجات، فلاح، فوز کا تصور سائنس کے بغیر کرنے سے عاجز ہیں۔ مدارس عربیہ کے طلباء اور علماء کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ بہت سے اشکالات دور کر دے گا اور مغرب کے مقابلے میں انھیں اعتماد و یقین عطا کرے گا۔ اس دور کا المیہ یہ ہے کہ ہم مغرب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو اعتماد و یقین کی دولت سے محرومی بھی ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ ہم اندر سے خائف ہیں اور اپنے خوف کو صرف خطابت سے چھپاتے ہیں۔ ہمیں یقین کی ضرورت ہے، ایسا پختہ یقین جو اس ایمان سے پھوٹے کہ مغرب باطل ہے، اسلام الحق ہے اس کے بعد یقین کی علمی بنیادیں تلاش کی جائیں لیکن یقین علم سے

مشروط نہیں ایمان سے مشروط ہے۔

1. Discourse on Method and the Meditations by Rene Descartes, translated by F. E. Sutcliffe
2. Crises of European Sciences by Edward Husserl. Mathematical Principles of Natural Philosophy.
3. Science A History, by John Gribbin
4. Newton to Einstein by Ralph Baicelain.
5. A History of Science by William Dampier
6. Galileo at Work by Stillman Drake
7. Issac Newton by Rupert Hall
8. Nicholas Copernicus by Josef Rednicbi.
9. The Scientific Work of Rene Descartes by J. F. Scott.
10. The Scientific Revolution by Steven Shapin
11. Science and the Modern World by A. N. Whitehead
12. Foresight and understanding by Stephen Toulmin
13. Philosophy of Science by Alexendar Bird
14. What is this thing called science by A. F. Chalmer
15. Between Science and Metaphysics by S. Amsterdamski
16. Belief, Truth and Knowledge by D. M. Armstrong
17. Truth and Logic by A. J Ayer
18. Two Paradigms of Scientific Knowledge by D. Bloor
19. The Natural Philosophy of Galileo by Maurice Clavelin
20. Feyerabends Discourse against Method by J. Curfhoys and W. Suchting
21. On Scientific Method by J. J. Daires
22. How to defend Society against science by P. K. Fayerabend
23. Two New Sciences by Galileo Galilei
24. Philosophy of Natural Science by C. G. Hampel
25. Treatise on Human Nature by D. Hume.
26. Metaphysics and Measurement by A. Koyre
27. The structure of Scientific Revolution by T. Kohn.

28. Proofs and Refutation by Z. Lakatos
29. The logic of Scientific Discovery by Karl Popper.
30. Science and Subjectivity by Israel Scheffler

(۵۱) جمال پانی پتی کی کتاب ''جدیدیت کی ابلیسیت''

(۵۲) ادبی رسالے ''مکالمہ'' کے متفرق شمارے جن میں جدیدیت پر جمال پانی پتی اور دیگر مفکرین کے قیمتی مضامین مل جاتے ہیں۔ ''مکالمہ'' جناب مبین مرزا کی زیرادارت شائع ہوتا ہے اور جدیدیت کا سخت ناقد۔ یہ نہایت علمی، تحقیقی اور ادبی رسالہ ہے۔

(۵۳) ضمیر علی بدایونی کی ''جدیدیت اور پس جدیدیت''

(۵۴) جریدہ ''روایت وتہذیب'' اور جریدہ ''روایت'' کے چھ شمارے۔ جو سہیل عمر اور سراج منیر کی زیرادارت شائع ہوئے۔ ان میں بعض مضامین نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

(۵۵) جریدہ ''اعلام'' لاہور شمارہ ۳ جس میں محمد حسن عسکری کی کتاب مغربی فکر کی گمراہیوں کا خاکہ پر جناب ڈاکٹر ساجد علی نے ''محمد حسن عسکری کا تصور روایت و مابعد الطبیعیات'' کے نام سے نہایت عالمانہ نقد کیا ہے۔

(۵۶) ماہنامہ فنون میں محمد عسکری کی کتاب ''جدیدیت'' اور اس کے متعلقات پر محمد ارشاد کے ناقدانہ مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

(۵۷) غرب زدگی (فارسی) جلال آل احمد تہران۔ انقلاب ایران کے زمانے کی مقبول ترین کتاب

(۵۸) ڈاکٹر علی محمد رضوی کا ایم فل کا مقالہ

[1] Focault on Freedom[2] Methodology underlying Imam Ghazali's critique of Greek Philosphy.(مطبوعہ جریدہ ۲۹)

(۵۹) ڈاکٹر عبدالوہاب سوری کا پی ایچ ڈی مقالہ Philosophical analysis

(مطبوعہ جریدہ ۳۴).of Rawl's Theory of Justice

(۶۰)الفکر الاسلامی الحدیث وصلتُه بالاستعمار الغربی:الدکتور محمد البهی

(۶۱)شاہنواز فاروقی کے کالموں کا مجموعہ ''کاغذ کے سپاہی'' اور ایم اے کے لئے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ''سلیم احمد'' مغربی فکر و فلسفے کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ''سلیم احمد'' والے مقالے میں تہذیب مغرب کی کشمکش سے ابھرنے والے بے شمار سوالات پر غور و فکر کا موقع میسر آتا ہے۔

(۶۲) قصة الایمان بین الفلسفة و علم القرآن:مفتی طرابلس الشیخ ندیم الجسر

(۶۳)ہائیڈیگر کی درج ذیل کتابیں:

[1] Being & Time [2] Question Concerning Technology.

(۶۴)اسلام پیغمبر اسلام اور مستشرقین مغرب کا انداز فکر: ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

(۶۵)ارکان اربعہ: ابوالحسن علی ندوی

(۶۶) تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب: ابوالحسن علی ندوی

(۶۷)دائرۃ المعارف الاسلامیہ جامعہ پنجاب۔ اس انسائیکلو پیڈیا میں مسلم فلاسفہ اور ان کے افکار و نظریات کے سلسلے میں اہم معلومات مل جاتی ہیں۔

(۶۸)معتزلہ کی تاریخ زہدی حسن جاراللہ پیش لفظ الفرڈ گیوم

(۶۹) الملل و النحل: ابن حزم اندلسی، ترجمہ عبداللہ العمادی

(۷۰)الملل و النحل: شہرستانی ترجمہ پروفیسر علی محسن صدیقی

(۷۱)الفرق بین الفرق: عبدالقاہر بغدادی

(۷۲)العقل و النقل: علامہ شبیر احمد عثمانی

(۷۳)قرآن حکیم کے وہ تمام متداول تراجم اور تفاسیر جو امت مسلمہ کے مسلمہ مکاتب

فکر کے ہاں رائج ہے۔

(۷۴) ٹونی کی کتاب Religion and Rise of Capitalism

(۷۵) میکس ویبر Capitalism and Protestant Ethics

(۷۶) بیرنگٹن مور Social Organs of Dictatorship and Democracy Lord and Peasent in the Making of Modren World.

(۷۷) رکسانہ لیوبن Enemy in the mirror

(۷۸) ڈاکٹر ڈیوڈ میکے Critique of Modernity

(۷۹) جرگین ہیبر ماس The Philosophical Discourse of Modernity

(۸۰) مغربی فکر و فلسفے کے التہاب والحاد سے پیدا ہونے والے اضطراب نے عالم اسلام کے مفکرین کو کس طرح متاثر کیا اور بڑے بڑے علماء وفضلاء کس طرح جدیدیت میں ڈوب گئے اور مغرب کی چکا چوند میں بہہ گئے۔ اس کا جائزہ بھی ضروری ہے اس سلسلے میں نیاز فتح پوری، علامہ مشرقی، غلام احمد پرویز، سرسید احمد خان، غلام جیلانی برق کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، جس سے مغربی یلغار کے اثرات کا اندازہ ہوگا۔ مغرب سے علمی سطح پر متاثر ہونے والے افراد کے تشکک اور تذبذب کا گہرا جائزہ لینے کے لیے علامہ اقبالؒ، احمد سعید اکبر آبادی، ڈاکٹر فضل الرحمن (سابق سربراہ ادارہ تحقیقات اسلامی) اور ڈاکٹر منظور احمد (سابق ریکٹر اسلامی یونیورسٹی) کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس مطالعے کے دوران یہ واضح ہوجائے گا کہ ڈاکٹر فضل الرحمن، ڈاکٹر منظور احمد، غلام احمد پرویز اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے تمام متجددین اور جدیدیت پسند علماء کی فکر علامہ اقبالؒ کے خطبات کے اعادہ سے زیادہ نہیں ہے اور خطبات کی تشکیک پر اپنے فکر و نظر کی عمارت تعمیر کرنا ان تمام جدیدیت پسندوں کا طرہ امتیاز ہے۔ اور تمام جدیدیت پسند مفکرین کی فکر عصر حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل کو مذہب کے دائرے میں حل کرنے کا دعویٰ کرتی ہے اور اس عمل کے

دوران یہ بھول جاتی ہے کہ دین اور اس کی تمام روایات دور از کار تاویلات کے نتیجے میں جدیدیت کی بھول بھلیوں میں نہ صرف گم ہو جاتی ہیں بلکہ اس طرح تحلیل ہوتی ہیں کہ اگلی نسل میں ان کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ مفتی عبدہٗ کے شاگرد رشید رضا کی وہ تحریریں پڑھ لی جائیں جو طٰہٰ حسین جیسے بے شمار عبدہ کے شاگردوں کے الحاد کے ردعمل میں لکھی گئیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کے خطبات 'تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ' جاوید غامدی کی 'اسلام کیا ہے' جو ان کے شاگرد ڈاکٹر محمد فاروق خان کے نام سے شائع ہوئی ہے، کا مطالعہ ضروری ہے (ڈاکٹر منظور احمد اور ڈاکٹر جاوید اقبال ان جدیدیت پسند دانشوروں میں شامل ہیں جو نہ عربی جانتے ہیں نہ فارسی ان کے علمی افلاس کا عالم یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں کسی عربی فارسی کتاب کا حوالہ نہیں ملتا، مگر دین پر اعتراضات میں یہ لوگ نہایت جری ہیں) عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ سے لے کر جسٹس جاوید اقبال اور ڈاکٹر منظور احمد تک ایک بھی جدیدیت پسند مفکر نہ اسلامی علوم پر عبور رکھتا ہے نہ عربی زبان سے گہری واقفیت، لیکن سب کو اجتہاد کا لپکا ہے۔

(۸۱) اقبال شناسی: ڈاکٹر منظور احمد (۸۲) اسلام اور چند فکری مسائل: ڈاکٹر منظور احمد

(۸۳) نیاز فتح پوری کی 'خدا اور تصور خدا' (یہ نگار کا خدا نمبر ہے جو سرقہ کیا گیا تھا۔ اس سرقے کی تفصیل ماہنامہ الدعوۃ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے شمارہ ۱۲، جلد ۵ میں ملاحظہ کیجیے)۔

(۸۴) مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، من ویزداں۔ یہ کتابیں ڈاکٹر منظور احمد کے الحادی منہاج میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے ایک خطبے میں ان کتابوں کو جدید فکر اسلامی کی تشکیل میں اہم مقام دیا ہے۔

(۸۵) عورتوں کے امتیازی مسائل اور قوانین۔ حکمتیں اور قواعد، حافظ صلاح الدین یوسف

(۸۶) فکریات، ترجمہ و ترتیب تحسین فراقی

(۸۷)مسلمان اور مغربی تعلیم پاک وہند میں، پروفیسر سید محمد سلیم

(۸۸)مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، پروفیسر سید محمد سلیم

(۸۹)برصغیر پاک وہند میں غیر ملکی زبانوں کے ماہر علماء، پروفیسر سید محمد سلیم

(۹۰)اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، سید قطب

ڈیکارٹ سے لے کر عہد حاضر کے عظیم فلسفی ڈیلوز تک اہم فلاسفہ کی کتابیں جس کے بغیر مغرب کا کلی ادراک محال ہے۔

(۹۱) Baruch spinoza: ETHICS

[1] Gottoried Wilhelm von Leibnize: [2] DISCOURSE ON METAPHYSICS

[3] MORADOLOGY

(۹۲) جان لاک[John Lock]

[1] AN ESSAY CONCERNING HUMAN UNDERSTANDING [3] A LETTER CONCERNING TOLERATION [3] CONCERNING CIVIL GOVERNMENT.

(۹۳) کی کتاب George Berkeley

THE PRINCIPLES OF HMAN KNOWLEDGE.

(۹۴) David Hume

[1] AN INQUIRY CONCERNING HUMAN UNDERSTANDING

[2]DIALOGUES CONCERING NATURAL RELIGION.

(۹۵) Immauel Kant:

[1] CRITIQUE OF PURE REASON [2]CRITIQUE OF PRACTICAL REASON [3] CRITIQUE OF JUDGMENT

[4]GROUNDWORK OF THE METAPHYSICS OF MORALS

[5]WHAT IS ENLIGHTENMENT

(۹۶) George Fridrich Hegel

[1] PHILOSOPHY OF RIGHT [2] PHILOSOPHY OF HISTORY

[3]PHENOMENOLOGY OF MIND

Karl Marks, Das Capital (4 vols)

(۹۷) Friedrlch Nietzsche:

[1] THE BIRTH OF TRAGEDY [2] UNTIMELY MEDITATIONS

[3] THUS SPOAKE ZERATHUSTRA [4] THE GENEALOGY OF MORALS [5] BEYOND GOOD AND EVIL.
(۹۸) Ayer, Alfred Jules: Language, Truth and Logic.
Derrida, Jacques
[1] OF GRAMMATOLOGY. [2] WRITING AND DIFFERENCE. [3]MARGINS OF PHILOSOPHY.
(۹۹) Dewey, John
[1] RECONSTRUCTION IN PHILOSOPHY. [2] THEORY OF VALUATION.
[3] HUMAN NATURE AND CONDUCT.
(۱۰۰) Dilthey, Wilhelm: INTRODUCTION TO THE HUMAN SCIENCES.
(۱۰۱) Foucault, Michel
[1] MADNESS AND CIVILIZATION [2] THE ORDER OF THINGS [3] THE ARCHAEOLOGY OF KNOWLEDGE [4] DISCIPLINE AND PUNISHMENT
(۱۰۲) Gadamer,Hans, George: [1] TRUTH AND METHOD.
Habermas, Jurgen
[1] THE PHILOSOPHICAL DISCOURSE OF MODERNITY [2]THE THEORY OF COMMUNICATIVE ACTION (2 VOLS)
(۱۰۳) Heideger, Martin
[1] BEING AND TIME [2] QUESTION CONCERNING TECHNOLOGY.
(۱۰۴) Husserl, Edmun [1] LOGICAL INVESTIGATIONS
James, William
[1] THE VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE [2]PRAGMATISM
(۱۰۵) Peirce, Charles: [1] SOME CONSEQUENCES OF FOUR CAPACITIES.
(۱۰۶) Popper, Karl
[1] OBJECTIVE KNOWLEDGE [2] THE OPEN SOCIETY AND ITS ENEMIES
(۱۰۷) Rawls, John
[1] A THEORY OF JUSTICE. [2] POLITICAL LIBERALISM

(۱۰۸) Ricoeur Paul
[1] HISTORY AND TRUTH [2] THE CONFLICT OF INTERPRETATION [3] THE ROLE OF METAPHOR.
(۱۰۹) Rorty, Richard
[1] CONTINGENCY, IRONY AND SOLIDARITY [2]OBJECTIVITY, RELATIVISM AND TRUTH
(۱۱۰) Wittgensteien, Ludwigl
[1] PHILOSOPHICAL INVESTIGATION
(۱۱۱) Gilles Deleuze and Felix Guttari
[1] ANTI OEDIPUS [2] THOUSAND PLATEOUS [3] WHAT IS PHILOSOPHY.

(۱۱۲) درج ذیل مطبوعات کا مطالعہ بھی سودمند رہے گا۔

☆ جریدہ ۲۲ ☆ جریدہ ۲۳ ☆ جریدہ ۲۴ ☆ جریدہ ۲۵ ☆ جریدہ ۲۸ ☆ جریدہ ۲۹ ☆ جریدہ ۳۰ ☆ جریدہ ۳۲ ☆ جریدہ ۳۳ ☆ جریدہ ۳۴ ☆ جریدہ ۳۵ ☆ جریدہ ۳۶: مرتبہ، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی (۱۱۳) ماہنامہ ساحل کراچی کا خاص موضوع مغربی تہذیب فلسفہ تاریخ کا ناقدانہ جائزہ ہے اس کی تمام فائلیں سودمند رہیں گی (۱۱۴) اسلام اور جدید سائنس نئے تناظر میں: محمد ظفر اقبال، کتاب محل لاہور (۱۱۵) اسلام اور جدیدیت کی کشمکش: محمد ظفر اقبال

(۱۱۴) مغربی فکر وفلسفے سے متعلق تعارفی مباحث، مغربی فلسفیوں کے تعارف، مغربی فلسفہ پر سرسری نقد کے لیے درج ذیل ویب سائٹس کا مطالعہ مفید رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ عالم اسلام میں اٹھنے والے عصری فتنوں، متجددین کے افکار، راسخ العقیدہ علماء کے الحادی افکار سے واقفیت کے لیے بھی درج ذیل ویب سائٹس سے قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

www.falsafeh.com
fallosafah.org
www.halgheh.com
www.sunna.org
pless.arabandalucia.com
www.osraty.com

www.khaled-alfaisal.com
www.lahdah.com
www.noo-problems.com
www.peykarandeesh.org/article
www.caricadonya.com
www.nizwa.com
www.arabworldboks.com/articles
www.shahnawazfarooqui.com
www.muslimphilosophy.com
www.alwaraq.net
plato.stanford.edu
www.enashir.com/blogs/tarik
www.jozoor.net
books.mirror.org
www.magiran.com
www.hupaa.com

شاہنواز فاروقی صاحب کی ویب سائٹ پر ان کے تمام کالم اور علمی کام میسر ہے، مغرب پر بعض تنقیدی مضامین علماء کرام کے لیے نہایت معلوماتی اور کارآمد ہیں۔ عام لوگوں کے لیے شاہنواز صاحب کے کالم نہایت آسان اور شگفتہ زبان میں لکھے جاتے ہیں اور علمی افراد کے لیے ان کی علمی شان بھی ہوتی ہے۔

فصل دوم

فکری تقاضے

اس فصل میں فکری استقلال، مغرب کی غلامی کا ردّ، اسلامائیزیشن کی بجائے اسلامی

تناظر میں تشکیلِ نو اور تجدد کی نفی کے موضوعات شامل ہیں۔

فکری استقلال

فکری استقلال کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی ایک الگ اور مستقل (انڈی پنڈنٹ) فکر ہے جو اپنے اصولوں پر کھڑی ہے، جو کسی سے مستعار نہیں لی گئی، جو کسی کی رہینِ منت نہیں ہے۔ ان مستشرقین کا موقف جھوٹ وافتراء پر مبنی ہے جو کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اوائل عمر میں شام گئے تھے اور وہاں عیسائی راہبوں سے ملے تھے اور وہاں ان سے متاثر ہو گئے تھے۔ یا وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اسلامی فقہ رومن لاء سے متاثر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی فکر ہر لحاظ سے ایک مستقل فکر ہے جس کے اپنے اصول وقواعد ہیں اور جو خداداد ہیں، وحی پر مبنی ہیں، حتمی ہیں، ظن وتخمین اور حشو وزوائد سے پاک ہیں۔ ہاں! معاشرت میں پہلے سے موجود معروفات کو بعینہٖ یا بعد از اصلاح قبول کرنا یا اجتہادی امور میں عرف ومصالح کی رعایت کرنا یا فروعات وتفصیلات میں دوسری تہذیبوں کے انسانی تجربات پر مشتمل کوئی چیز لے کر اسے اپنے رنگ میں ڈھال لینا اور قبول کر لینا یا مسلم اہل علم کا نصوص کی تاویل اور ان سے اخذ واستنباط کے کئی اسالیب اختیار کر لینا... تو یہ امور شریعت اسلامی کی خوبیاں ہیں اور اس کی حکمت ووسعت پر دلالت کرتی ہیں نہ کہ اس کی خامی اور کمزوری ہیں۔

مغرب کی غلامی کا ردّ

اس وقت تک ہم نے اسلام اور مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں جو کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اسلام کی اپنی ایک منفرد فکر ہے جو ہر لحاظ سے الگ اور مستقل (انڈی پینڈنٹ) ہے، جس کے اپنے اصول ہیں جو کسی سے مستفاد نہیں ہیں۔ اس کا اپنا ایک رنگ ہے جو خوشنما اور پائیدار ہے اور وہ دوسرے رنگوں کو قبول نہیں کرتا۔

۲۔ مغربی فکر وتہذیب کے اصول ومبادی نہ صرف اسلام سے مختلف ہیں بس اس

سے متضاد ہیں۔ یہ کفر وشرک اور نصرانیت و یہودیت کا مجموعہ ہے۔

۳۔ قرآن وسنت نے بتایا ہے کہ یہود و ہنود اور کفار ومشرکین اسلام اور مسلمانوں کے بہی خواہ نہیں ہیں بلکہ ان کے دشمن ہیں اور انہیں نیست ونابود کرنا چاہتے ہیں۔حق و باطل اور کفر واسلام ایک نہیں ہو سکتے۔

۴۔ ماضی میں بھی یہود ونصاریٰ اور کفار ومشرکین کا رویہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مخاصمانہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار مغربی ممالک نے دو تین صدیاں پہلے مسلمانوں کو کمزور دیکھ کر انہیں دبالیا، کچل دیا، غلام بنالیا، انہیں مستقل غلام بنائے رکھنے کی منصوبہ بندی کی اور آج بھی ہمارے دیکھتے وہ مسلمان ممالک کو پرامن طریقے سے دجل وفریب اور سازشوں سے اپنے دام فریب میں جکڑے ہوئے ہیں اور جو پھر بھی قابو نہ آئیں انہیں آہنی قوت سے کچل ڈالتے ہیں۔

ان حالات کا تقاضا ہے کہ مسلمان مغربی فکر وتہذیب کو ردّ کر دیں کیونکہ یہ مبنی بر کفر و الحاد ہے، اسلام سے متضاد ہے بلکہ دین ماسوا اللہ ہے۔اس کو اپنانا انہیں اپنے دین سے دور کر دے گا جس کا نتیجہ دنیا وآخرت دونوں کی تباہی ہوگا۔ہم سطور بالا میں تفصیل سے عرض کر چکے کہ مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار اگر مسلمانوں کو یہ کہتے ہیں کہ وہ ان کی فکر وتہذیب کو اپنالیں تا کہ دنیا میں ترقی کر سکیں اور کامیابی حاصل کر سکیں تو یہ دجل وفریب ہے، یہ جھانسا اور دھوکہ ہے۔ اور جو مسلمان مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر ہو کر یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو مغربی فکر وتہذیب کو اپنالینا چاہیے وہ ان کے جھانسے میں آئے ہوئے ہیں، وہ فریب خوردہ ہیں، وہ ان کے فکری غلام ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اسلام کی حقیقت پر غور کریں، قرآن وسنت کا گہرا مطالعہ کریں تو انہیں سمجھ آجائے گی کہ اسلام دنیا وآخرت میں کامیابی کا واحد نسخہ ہے۔مسلمانوں نے اسلامی اصولوں پر عمل کر کے ماضی میں دنیا میں عزت وکامیابی حاصل کی اور آج بھی کر سکتے ہیں اور اس کے لیے انہیں مغربی فکر وتہذیب کی

دریوزہ گری، پیروی اور اسے اپنانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان اپنی فکر، اپنے نظریۂ حیات اور اپنے دین پر اعتماد کریں، اس کے حتمی طور پر درست اور قابل عمل ہونے کو سمجھیں اور اس پر عمل درآمد کے لیے کمر کس لیں، اس راہ کی ساری رکاوٹوں کو ختم کریں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو عملاً اسلام کے رنگ میں ڈھال لیں۔ اس کا ایک ناگزیر تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ مغربی فکر وتہذیب کو علی الاعلان اور علی وجہ البصیرت ردّ کر دیں اور سمجھ لیں کہ یہ شیطان کی چال ہے، دھوکہ اور فریب نفس ہے۔ ہر وہ راہ جو مکہ اور مدینہ کو نہیں جاتی، وہ ان کی منزل کو کھوٹا کرنے والی ہے لہٰذا اسلام اور اس کے حق اور قابل عمل ہونے پر یکسوئی اور غیر اسلام کو ردّ کرنے پر فکری وقلبی اطمینان ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سب مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

اسلامائیزیشن کی بجائے اسلامی تناظر میں تشکیل نو کی ضرورت

مغرب کی فکر وتہذیب چونکہ اس وقت دنیا پر غالب اور بالادست ہے لہٰذا دنیا بھر میں، بشمول مسلمان معاشرے اور ممالک، مغربی فکر اور اس کے پیدا کردہ تصورات، علوم اور ادارے ہی مروج اور نافذ ہیں۔ اور جب مسلمانوں کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ فکری تصورات اور علوم غیر اسلامی ہیں تو بعض مسلمان اہل علم انہیں اسلام کے مطابق بنانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ مغربی فکر وتہذیب کے قائم کردہ علوم اور اداروں میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے انہیں گویا مشرف بہ اسلام کر لیتے ہیں۔ مغرب کے علوم اور اداروں کو اسلام کے مطابق بنانے کے اس عمل کو ان کی اسلامائزیشن یا اسلام کاری کہا جاتا ہے۔ جیسے مغرب کی جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دیا جائے یا مغرب کے قائم کردہ بنکنگ کے نظام میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے مطابقِ شریعت (Shariah compliant) بنا دیا جائے اور اسے 'اسلامی بنکنگ' قرار دے دیا جائے۔

ہمارے نزدیک یہ طریقہ غلط اور نا قابل قبول ہے کیونکہ:

۱۔ اس طرح کے لینے دینے ، اخذ واستنباط اور تلفیق وادغام کا کام دوقریب المزاج اور بنیادی فکر میں ہم آہنگی رکھنے والے علوم اور اداروں میں تو ہوسکتا ہے لیکن ان علوم اور اداروں میں نہیں ہوسکتا جن کی بنیادی فکر ایک دوسرے سے متضاد ہو۔

ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ کسی بھی تہذیب میں ادارے پیداوار ہوتے ہیں علوم کی ،علوم پیداوار ہوتے ہیں فلسفۂ علم کی ،فلسفۂ علم پیداوار ہوتا ہے ورلڈ ویو کی اور ورلڈ ویو پیداوار ہوتا ہے بنیادی نظریات اور عقائد کی۔ مغرب کے بنیادی نظریات ہیومنزم ، سیکولرزم ،لبرل ازم ،کیپٹل ازم وغیرہ کفر والحاد پر مبنی ہیں۔ خدا کی خدائی کا انکار کرتے اور اس کے مقابلے میں انسان کی خدائی اور اس کی لامحدود آزادی کا اثبات کرتے ہیں اور آخرت کا انکار کرتے ہوئے دنیا اور اس کی بہتری ہی کو ساری انسانی جدوجہد کا مرکز گردانتے ہیں۔ ان کا فلسفۂ علم وحی کا انکار کرتا اور انسانی عقل وتجربہ کی بالادستی کا اعلان کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے نتیجے میں جو علوم اور ادارے پروان چڑھیں گے وہ اسلامی نہیں ہوسکتے اور نہ انہیں معمولی درخ اندوازی سے اسلامی بنایا جاسکتا ہے لہٰذا مغربی علوم اور اداروں کی اسلامائزیشن یا اسلام کاری یا معمولی کتر بیونت سے انہیں مطابق اسلام قرار دینا غلط ہے۔ یہ خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ یہ غلط علمی رویہ ہے۔

۲۔ اگر مسلمان مغربی علوم وتصورات کو اپنائیں گے تو یہ لازماً انہیں نامسلمان بنائیں گے کیونکہ دو متضاد افکار کا ایک دماغ وقلب میں یکجا ہونا لازماً فکری تشتت ، ذہنی انتشار اور خلط وکنفیوژن کا سبب بنے گا جس کی وجہ سے یکسو اور مستحکم شخصیت وجود میں نہ آسکے گی۔ فکری عدم یکسوئی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی ایک خاص رُخ میں عادات پختہ نہ ہوں گی۔ رویے وجود میں نہ آئیں گے، صلاحیتیں نمو نہ پائیں گی اور اعلیٰ کیریکٹر وجود میں نہ آسکے گا۔ مسلمانوں میں بدکرداری اور بے کرداری یعنی اعلیٰ کیریکٹر وجود میں نہ آنے اور باصلاحیت، محنتی،

ذہین، عبقری اور دین دار افراد پیدا نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی فکری انتشار ہے۔

یہ حالت تعمیر شخصیت کے لحاظ سے افراد کی ہوگی اور مغربی فکر وتہذیب کے علوم وادارے اگر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں رواج پا جائیں اور سرایت کر جائیں یا حکمران اور بالا دست طبقے (عدلیہ، فوج، بیوروکریسی اور سیاستدان) انہیں ریاستی قوت سے معاشرے میں نافذ کر دیں جیسے مغربی طرز کی جمہوریت، مغربی سٹائل کی سرمایہ دارانہ سودی معیشت، مغربی طرز کا میڈیا اور مغربی سٹائل کی عدالتیں.... وغیرہ) تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ (یعنی افراد معاشرہ) میں انارکی اور فساد پھیلے گا، ان کے اخلاق تباہ ہوں گے، معیشت کمزور ہو جائے گی، سیاسی عدم استحکام پیدا ہوگا، عدل وانصاف عنقا ہو جائیں گے، امن وامان ختم ہو جائے گا، غیر اسلامی رسوم ورواج پروان چڑھیں گے، لوگ دین سے دور ہوتے جائیں گے، معاشرہ بحیثیت مجموعی کمزور ہوتا چلا جائے گا اور زوال کے گڑھے سے باہر نہیں نکل سکے گا۔ یہی پوزیشن عملاً اس وقت پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کی ہے اور اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو ہم نے بتائی یعنی مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو رد نہ کرنا بلکہ اسے حیلے بہانے قبول کر لینا۔

۳۔ مغربی علوم اور اداروں کی اسلامائزیشن کا ایک نتیجہ تجدد کی صورت میں نکلے گا یعنی مغربی علوم اور اداروں کو اچھا سمجھنے اور ان کو قابل قبول بننے کی تگ ودو یہ صورت اختیار کرے گی کہ آپ اسلام کو مغربی علوم واداروں کی خدمت میں لگا دیں گے، اسلامی تعلیمات کو مغربی اصول واقدار کے پیمانے سے ناپنا شروع کر دیں گے اور اسلامی تعلیمات کو مغربی اصول واقدار کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیں گے۔ ان کی ایسی وضاحت اور تاویل وتعبیر کرنا شروع کر دیں گے جو مغربی اصول واقدار کے مطابق ہو اور ان کے خلاف نہ محسوس ہو۔ اسلامی نصوص واحکام کی تاویل وتشریح مغربی فکر وتہذیب کی روشنی میں کرنا اور انہیں کھینچ تان کر مغربی فکر وتہذیب کے مطابق بنانا، یہ اسلامائزیشن نہیں مغربائزیشن (Westernization)

ہے اور یہی تجدد ہے جس کا قابل مذمت ہونا واضح ہے کہ اس طرح مغربی فکر و تہذیب اسلام اور اسلامی تعلیمات پر حاوی ہوتی چلی جائے گی۔

۴۔ مغربی علوم اور اداروں کی اسلامائزیشن کا لازمی اور حتمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاشرے اور ریاست میں مغربی فکر و تہذیب اور اس کے اصول واقدار غالب آتے چلے جائیں گے اور اسلام اور اسلامی تعلیمات اور اصول واقدار مغلوب ہوتے جائیں گے۔ دوسرے اسلامی ممالک کے علاوہ اس تجربے کی بہترین مثال پاکستان ہے کہ ہمارے ارباب حل وعقد نے دینی حلقوں کی معاونت اور اشیر باد سے مغربی جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کیے اور اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا۔ مغربی بنکنگ میں کچھ اسلامی اصول ڈالے اور اسے 'اسلامی بنکنگ' قرار دے دیا اور لارڈ میکالے کے بنا کردہ نظام تعلیم میں ایک مریل سی اسلامیات کا اضافہ کر کے اسے اسلامی نظامِ تعلیم کہنے لگے اور اسے اپنے لیے قابل قبول بنالیا اور اسے پرائیویٹ سیکٹر کے لیے مال تجارت بنا دیا۔

اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پاکستان میں مغربی فکر و تہذیب غالب آ گئی ہے اور اسلام پیچھے رہ گیا ہے۔ جمہوریت سیکولر ہو گئی ہے۔ سیکولر سیاسی جماعتیں غالب آ گئی ہیں اور دینی سیاسی جماعتیں پٹ گئی ہیں۔ مغرب کے سرمایہ دارانہ اور سودی نظام کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پاکستان کی نصف آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور نانِ جویں کی محتاج ہے۔ نظام تعلیم کا حال یہ ہے کہ دینی جماعتوں کے کارکنوں کے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں مغربی فکر و تہذیب کی اشاعت اور فروغ کے مرکز بن کر رہ گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. یہ کوئی مفروضہ اور ہوائی باتیں نہیں ہیں، یہ وہ حقائق ہیں جو پاکستان میں کھلی آنکھوں سب کو نظر آ رہے ہیں۔ اگر کوئی نہ دیکھنا چاہے یا مغرب کی عینک لگا کر دیکھے تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

اسلامی علوم اور اداروں کی تشکیلِ نو

اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی علوم واداروں کی اسلامائزیشن کے عمل کو قبول کرنا ایک لحاظ سے نتیجہ ہے مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت اور اس سے متاثر ہو جانے کا اور یہ بالواسطہ طور پر اسے قبول کرنے کے مترادف ہے۔ اگر ہم مغربی فکر وتہذیب کے ردّ کا فیصلہ کریں (جو کہ ہماری رائے میں ہمیں کرنا چاہیے) تو اس کے نتیجے میں ہمیں مغربی علوم اور اداروں کی اسلامائزیشن کی بجائے اسلامی علوم اور اداروں کی تشکیل نو کا سوچنا چاہیے۔ یہ ایک اجتہادی اور تحقیقی نوعیت کا کام ہے جس کی طرف امت کے ایسے اہل علم اور بہترین دماغوں کو توجہ کرنی چاہیے جو قرآن وسنت کے ماہر ہوں، امت کے تہذیبی ورثے اور تجربے پر جن کی نظر ہو، عصری ضرورتوں اور تقاضوں کا جنہیں ادراک ہو اور مغربی فکر وتہذیب کے خوب وناخوب کا جو بخوبی احساس رکھتے ہوں۔ اس کام کا اصولی لائحہ عمل یہ ہوسکتا ہے:

۱۔ قرآن وسنت کے احکام کی پابندی اور انہیں ہمیشہ سامنے رکھنا۔

۲۔ ماضی میں امت نے جس طرح اپنے عقائد اور ورلڈ ویو کی روشنی میں علوم کو ترقی دی (علوم نقلیہ وعقلیہ دونوں کو) اور جس طرح افراد کی تعمیر شخصیت کے لیے کام کیا اور جس طرح کے اجتماعی ادارے قائم کیے (تعلیمی، تربیتی، سیاسی، معاشی، قانونی، ثقافتی....وغیرہ) انہیں سامنے رکھنا۔

۳۔ عصری ضروریات سے صَرفِ نظر نہ کرنا کیونکہ عصری ضروریات سے صَرفِ نظر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسلام کو عصر حاضر کے لیے قابل عمل ثابت نہیں کر سکتے یا کرنا نہیں چاہتے اور یہ دونوں صورتیں اسلام اور مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہونی چاہئیں۔

۴۔ مغرب کے خوب وناخوب سے واقف ہونا۔ مطلب یہ کہ عصر حاضر میں اسلامی علوم اور اداروں کی تشکیل نو کا کام وہ فرد نہیں کرسکتا جس نے مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ نہ کیا ہو اور اسلامی تناظر میں اس کا تنقیدی مطالعہ نہ کیا ہو۔

مغربی فکر وتہذیب کے بارے میں ہمارا ردّ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اس کے بارے میں

ہم سطور سابقہ میں اپنا نقطۂ نظر واضح کر چکے ہیں کہ ہمیں اصولی طور پر مغربی فکر وتہذیب کو الحادی اور غیر اسلامی ہونے کی بنا پر ردّ کرنا ہے اور ہم اس کے ان نظریات اور تصورات کو نہیں لے سکتے جو Value-Loaded ہیں یعنی جو ان کے ملحدانہ نظریات کا نچوڑ ہیں اور ان پر مبنی ہیں۔ تاہم مغربی فکر وتہذیب کے وہ امور جن کی نوعیت انسانی تجربے کی ہے ہم انہیں لے کر اور اپنے رنگ میں ڈھال کر انہیں اپنے لیے قابل قبول بنا سکتے ہیں۔ جس کی مثال یہ ہے کہ ہم مغربی جمہوریت کو قبول نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی بنیادیں الحادی اور غیر اسلامی ہیں مثلاً حاکمیت اعلیٰ جمہور عوام کو حاصل ہے اور وہی حلال وحرام اور جائز وناجائز کا فیصلہ کریں گے۔ افراد عوامی نمائندگی اور مناصب کے لیے امیدوار بن سکتے ہیں، اس کے لیے اپنا مال خرچ کر سکتے ہیں، اپنی تعریف وتوصیف کے پل باندھ سکتے ہیں اور لوگوں سے جھوٹے وعدے کر سکتے ہیں.... وغیرہ۔ تاہم اس نظام جمہوریت کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو انسانی تجربے سے مفید ثابت ہوئی ہیں جیسے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے انتخابات کا کوئی طریقہ وضع کرنا یا اختیارات کو ایک شخص یا ادارے میں مرتکز رکھنے کی بجائے افراد اور اداروں میں تقسیم کر دینا یا سربراہ حکومت کو تاعمر باقی رکھنے کی بجائے کسی خاص مدت تک محدود کر دینا.... یہ وہ چیزیں ہیں جو حرام اور نظریاتی نہیں ہیں۔ ان میں جو چیزیں غیر اسلامی ہیں انہیں چھوڑ دیا جائے اور اس بارے میں جو اسلامی تعلیمات وروایات ہیں انہیں پیش نظر رکھا جائے اور ان تصورات اور اداروں کی تفصیلات اسلامی اصول واقدار وروایات کو سامنے رکھ کر طے کی جائیں تو انہیں اپنے لیے قابل قبول بنایا جا سکتا ہے۔

ان چار اصولوں پر صحیح سپرٹ میں وہی لوگ کام کر سکتے ہیں جو اسلامی اصول واقدار وروایات کا گہرا ادراک رکھتے ہوں اور عصرِ حاضر میں ان پر عمل کے لیے پُر جوش ہوں، جو مغربی فکر وتہذیب کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس کے Value-Loaded اور مباح حصوں کی پہچان رکھتے ہوں اور اس کے مباح حصوں کو لے کر انہیں اسلامی اصول واقدار وروایات

کے مطابق ڈھال سکتے ہوں اور جو حقیقی عصری ضرورتوں کا ادراک رکھتے ہوں۔ 'حقیقی عصری ضرورتوں' کا ادراک رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ ان ابن الوقتوں میں سے نہ ہوں جو مغربی فکر و تہذیب کی پیروی ہی کو روحِ عصر اور وقت کا تقاضا سمجھتے ہوں بلکہ یہ سمجھنے پر قادر ہوں کہ 'ضروریات' کیا ہیں اور وہ حاجیات اور تحسینیات سے کیسے مختلف ہیں؟ کون سی چیزیں مقاصد شریعت کو پورا کرنے والی ہیں اور مسلمانوں کے حقیقی مصالح کیا ہیں؟

ہمیں توقع ہے کہ ان امور کو پیش نظر رکھ کر اگر عصر حاضر اور اداروں کی تشکیل نو کا کام کیا جائے تو مستحکم مسلم شخصیت پیدا کرنے میں اور مستحکم مسلم معاشرہ اور مستحکم مسلم ریاست قائم کرنے میں کامیابی ہمارے قدم چوم سکتی ہے، ان شاء اللہ۔

فصل سوم

عملی تقاضے

اگر ہم مغربی فکر و تہذیب کو غیر اسلامی اور الحادی قرار دے کر ردّ کر دیں تو اس کا تقاضا

یہ ہے کہ ہماری دینی تحریکیں، ادارے، طبقات اور افراد سب اپنے اپنے نقطۂ نظر اور لائحہ عمل پر نظر ثانی کریں کیونکہ انہوں نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا ہوا ہے اور جو لائحہ عمل اپنایا ہوا ہے اس میں وہ یا تو مغربی فکر و تہذیب سے متاثر ہیں یا مغربی تہذیب کے ردّ عمل میں غیر متوازن ہو گئے ہیں۔ ہم نے ان جماعتوں، اداروں، طبقوں اور افراد کو الگ الگ زیر بحث لانے کے لیے تین مباحث میں تقسیم کیا ہے:

مبحث اوّل

تحریکیں/ جماعتیں: اصلاحی و تبلیغی تحریکیں۔ دینی سیاسی جماعتیں، سیاسی جماعتیں

مبحث دوم

ادارے: دینی مدارس، جدید تعلیم، میڈیا، مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ

مبحث سوم

طبقات وافراد: حکمران، علماء کرام، صوفیائے عظام، دانشور/ ادیب/ صحافی/ اینکر پرسن، جج، وکلاء، اساتذہ وغیرہ

مبحث اوّل

تحریکیں و جماعتیں: اصلاحی و تبلیغی تحریکیں۔ دینی سیاسی جماعتیں، سیکولر سیاسی جماعتیں

تبلیغی و اصلاحی تحریکیں

تبلیغی و اصلاحی تحریکوں کو جن میں سر فہرست تبلیغی جماعت ہے، اس امر کا ادراک کرنا

چاہیے کہ:

۱۔ ان کی جماعت کا لائحہ عمل ان کی جماعت کے قائدین کے اجتہادی فیصلے پر مبنی ہے، قرآن کا حرف نہیں ہے اور اس میں غلطی کا امکان ہے۔ عصر حاضر میں دعوت و تبلیغ کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں اور وہ سارے طریقے، جن میں قرآن و سنت کی اساسات کو ملحوظ رکھا گیا ہو، وہ اسلامی ہیں اور صحیح ہیں۔ ان مختلف طریقوں میں سے ایک طریقۂ تبلیغ ان کی جماعت کا بھی ہے۔

۲۔ ان کی جماعت کی بنیاد انگریزی عہد میں پڑی اور ان کا منہج مغربی فکر و تہذیب کے ردّ عمل پر مبنی ہے۔

۳۔ ان کا منہج پورے دین کی تبلیغ اور اس پر عمل کا علمبردار نہیں بلکہ صرف دین کی بنیادی باتوں اور عبادات تک محدود ہے۔ وہ مسلم معاشرے اور ریاست کی اجتماعی زندگی سیاست، معیشت، معاشرت، ثقافت، عدالت....وغیرہ پر توجہ نہیں دیتا اور نہ فرد کو ان ذمہ داریوں کے لیے تیار کرتا ہے۔

۴۔ ان کا منہج مغربی فکر و تہذیب کو ردّ نہیں کرتا حالانکہ موسسین جماعت کو اس کا عملی تجربہ تھا کہ انگریز اسلام اور مسلم دشمن تھا۔ وہ اگر زورِ بازو سے انگریزی بالادستی ختم نہیں کر سکے تو علمی، فکری اور تعلیمی لحاظ سے تو انہیں ردّ مغرب کا کام کرنا چاہیے تھا اور تبلیغی جماعت سے یہ کام لینا چاہیے تھا جو نہیں لیا گیا۔

دینی سیاسی جماعتیں

پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کو اگر اس امر کا ادراک ہو جائے کہ مغربی فکر و تہذیب شرعاً قابل ردّ ہے تو پھر انہیں سمجھ جانا چاہیے کہ:

۱۔ ملک میں مروج 'اسلامی جمہوریت' اپنے عمومی مزاج میں مغرب کی الحادی، سرمایہ دارانہ اور لبرل جمہوریت جیسی ہی ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ پاکستان کے حکمران بلکہ

حکمران طبقے (فوج، عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ) اور اشرافیہ بالعموم مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہے اور اس کی پیروی ہی کو کامیابی اور ترقی کا ذریعہ اور معراج سمجھتی ہے۔ اس لیے مغربی جمہوریت نما اس اسلامی جمہوریت کی وجہ سے ملک میں مغربی فکر وتہذیب کے اصول واقدار جیسے سیکولرزم، لبرل ازم اور کیپٹل ازم وغیرہ غالب آ گئے ہیں، اسلامی اصول واقدار پسپا ہو گئے ہیں اور مسلمان دن بدن اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

۲۔ اسی وجہ سے دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہوگئی ہیں بلکہ صحیح تر لفظوں میں مغربی طاقتوں اور ان کے کاسہ لیس مسلم حکمرانوں نے منصوبہ بندی اور پلاننگ سے ان کو ناکام بنایا ہے اور انہیں جیتنے نہیں دیا۔

۳۔ دینی سیاسی جماعتوں کو ناکام کرنے کے لیے مغربی قوتوں کی شہ پر مغرب زدہ مسلمان حکمرانوں نے مسلک کی بنیاد پر دینی سیاسی جماعتوں کے قیام اور عملی جدوجہد کی حوصلہ افزائی کی ہے، انہیں آپس میں لڑایا اور کمزور کیا ہے تاکہ مولوی لوگ آپس میں لڑتے رہیں اور وہ مقابلتاً آسانی سے انتخابات جیتتے اور حکومت کرتے رہیں۔

۴۔ ان حالات کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی مسلک پرستانہ روش چھوڑ کر باہم متحد ہو جائیں اور مل کر نفاذ شریعت کا مطالبہ اٹھائیں اور اسے کامیاب کرائیں، جو وہ نہیں کر رہے۔

۵۔ انہیں پاکستان میں غلبۂ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے صرف سیاسی جدوجہد پر اکتفاء نہیں کرنا چاہیے بلکہ دعوت واصلاح اور تعلیم وتربیت کے ذریعے مسلم فرد کی متوازن اصلاح پر بھی کام کرنا چاہیے تاکہ یکسو مسلم شخصیت تیار ہو سکے جو دلی رضا اور خوشی سے اپنی انفرادی زندگی میں اسلام کے احکام پر عمل کرے اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق گزارنے کے لیے دینی سیاسی جماعتوں کی فعال حمایت کر کے انہیں سیاست میں کامیاب کرائے۔

۶۔ پاکستان کی دینی سیاسی جماعتوں کو مغربی جمہوریت کی اسلامائیزیشن والی روش

سے باز آ جانا چاہیے اور مغربی جمہوریت والے خصائص رکھنے والی 'اسلامی جمہوریت' ترک کر دینی چاہیے نیز انہیں چاہیے کہ اجتہادی رویہ اپنا کر اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیلِ نو کریں اور اسے مسلم حکمرانوں سے منوا کر ملک میں نافذ کرائیں۔

پاکستان کی سیکولر سیاسی جماعتیں

ہم نے پاکستان کی سیاسی جماعتوں کو سیکولر ان کو 'دینی سیاسی جماعتوں' سے متمیز کرنے کے لیے کہا ہے ورنہ ان کو چلانے والے پاکستانی مسلمان ہی ہیں اور یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ وہ سب سیکولر، لبرل، ملحد، بے دین اور مغرب زدہ ہیں بلکہ دینی قوتوں کو چاہیے کہ انہیں اور پاکستانی اشرافیہ کو سچا مسلمان بنانے کی جدوجہد کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ "كلموا الناس على حسب عقولهم" کے اصول پر عمل کریں اور ان کے لیے حسب حال تعلیم و تربیت کے خصوصی ادارے قائم کریں جیسے مثلاً 'ایچی سن سکول کی طرز کے ایک عالی شان 'اسلامی ایچی سن سکول' اور 'لمز'' کے مقابلے میں ایک ''اسلامی لمز'' کا قیام اور مقننہ اور انتظامیہ کے افراد کی تربیت کے لیے فائیو سٹار ہوٹلوں میں ورکشاپس کا انعقاد وغیرہ۔

مبحث دوم: ادارے

اداروں میں دینی مدارس، جدید تعلیم، میڈیا، مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ، فوج، معیشت، معاشرت وغیرہ شامل ہیں۔ ان اداروں کے لیے اگر تسلیم کر لیا جائے کہ انہیں اسلامی اصولوں کے مطابق چلانا ہے نہ کہ مغربی فکر و تہذیب کے مطابق، تو اس کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

دینی مدارس

۱۔ دینی مدارس کو اپنی یہ پالیسی ترک کر دینی چاہیے کہ وہ صرف مدارس اور مساجد کے لیے افراد تیار کریں گے بلکہ انہیں پاکستانی معاشرے اور ریاست کو چلانے کے لیے افراد بھی تیار کرنے چاہئیں جیسا کہ ان کے اسلاف ماضی میں کرتے رہے ہیں۔

۲۔ انہیں یہ اصرار بھی ترک کر دینا چاہیے کہ وہ صرف قرآن، حدیث، فقہ، عربی زبان.... یا علوم نقلیہ پڑھائیں گے بلکہ انہیں عصری دنیاوی علوم (یا علوم حِکمیہ) بھی اسلامی تناظر میں پڑھانے چاہئیں خصوصاً سوشل سائنسز کی اسلامی نقطۂ نظر سے تدریس وتحقیق تو انتہائی اہم اور ضروری ہے کیونکہ یہ فرد کی تعمیر شخصیت اور معاشرے اور ریاست کی اسلامی تشکیلِ نو میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

۳۔ اس وقت انہوں نے پاکستان کے مسلم معاشرے اور ریاست کو چلانے کا کام کالجوں یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے ان طلبہ کے سپرد کر رکھا ہے جن کی اسلامی تعلیم وتربیت کا اہتمام نہ ریاست نے کیا ہے اور نہ دینی قوتوں نے، لہٰذا ان کی اکثریت سیکولر، لبرل، مادہ پرست اور مغرب زدہ ہے۔ دینی مدارس کے علماء کرام کو اپنے طلبہ کی ایسی تربیت کرنی چاہیے کہ وہ کارگہ حیات میں مثبت، فعال، تعمیری اور رہنما کردار ادا کر سکیں اور ہر شعبۂ حیات کو اسلامی تقاضوں کے مطابق چلانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ یاد رہے کہ اگر وہ ماضی میں ۱۲ سو سال تک ایسے افراد تیار کرتے رہے ہیں تو آج کیوں تیار نہیں کر سکتے؟

۴۔ وہ اپنے نصاب اور نظام کو اس طرح تبدیل کریں کہ وہ رسوخ فی العلم اور اجتہاد کی صلاحیت اور بصیرت رکھنے والے افراد تیار کریں جو عصر حاضر کی غالب الحادی تہذیب کو علمی سطح پر ردّ کر سکیں اور اسلام کی حقانیت اور اس کا آج بھی قابل عمل ہونا اور اصلح اور نافع ہونا دنیا پر ثابت کر سکیں۔

۵۔ یاد رہے کہ دینی مدارس کو نہ صرف علوم حِکمیہ (یعنی دنیاوی عصری علوم) پڑھانے

چاہئیں بلکہ ان کا علوم نقلیہ کا نصاب بھی محتاج نظر ثانی ہے تاکہ وہ قرآن وحدیث وفقہ کو اس طرح پڑھا سکیں کہ یہ علوم عصر حاضر کے مسلم فرد، معاشرے اور ریاست کو درپیش چیلنجز کا جواب دے سکیں اور دنیا کی غالب تہذیب (یعنی مغربی فکر وتہذیب) کے پیدا کردہ مسائل کا حل پیش کر سکیں اور مسلمانوں کو مغرب کی فکری غلامی سے آزاد کرا سکیں۔

۶۔ پاکستان میں اکثر دینی مدارس آج بھی دیوبند ماڈل کی پیروی میں قائم کیے اور چلائے جا رہے ہیں اور وہ آج بھی اسی کے نظام ونصاب کی تقلید اعمی کر رہے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس کی تعلیم کو ری ماڈل کیا جائے یعنی اوپر ذکر کردہ اصولوں کے مطابق ایک نیا رول ماڈل دینی مدرسہ قائم کیا جائے اور پھر دیگر مدارس اس نئے رول ماڈل یا نئے رجحان ساز (Trend Setter) دینی مدرسے کی نقل کریں۔

۷۔ مغربی فکر وتہذیب کا تنقیدی مطالعہ

کسی دینی مدرسہ میں مغربی فکر وتہذیب کا نہ تو تعارفی مطالعہ کرایا جاتا ہے اور نہ اس پر تنقید کر کے اسے اسلام سے مختلف ومتضاد ثابت کیا جاتا ہے اور نہ طلبہ کو یہ بتایا جاتا ہے کہ مغرب کس طرح پر امن طریقوں اور سازشوں سے مسلم معاشروں اور ریاستوں میں وہاں کی اشرافیہ اور حکمرانوں اور مؤثر طبقات کو اپنے جال میں جکڑ کر ان سے خلافِ اسلام اقدامات کراتا ہے اور اگر پھر بھی کوئی ریاست اس کے قابو میں نہ آئے تو آہنی قوت سے اسے کچل دیتا ہے جیسا کہ عراق، افغانستان اور لیبیا میں ہو چکا ہے۔شام اور یمن میں ہو رہا ہے اور پاکستان وایران پر دباؤ جاری ہے۔

۸۔ تحقیق

دینی مدارس کے کرتا دھرتا لوگوں کو اس امر کا بھی ادراک کرنا چاہیے کہ تعلیم کی نہ ابتداء ان کے ہاتھ میں ہے نہ انتہاء، بلکہ وہ مڈل یا میٹرک پاس بچے لیتے ہیں اور مڈل اور میٹرک تک کی تعلیم دینی مدارس خود نہیں دیتے بلکہ معاشرے کا سیکولر جدید نظام تعلیم جس طرح سے

چاہتا ہے بچے کی ابتدائی زندگی کے ان چند اہم سالوں کی تعلیمی صورت گری کرتا ہے جو اس کی شخصیت پر فیصلہ کن اثرات مرتب کرتی ہے۔ اسی طرح ۸ سالہ درس نظامی کے بعد بھی تخصص کی تعلیم کا یعنی علوم اسلامیہ میں ایم فِل اور پی ایچ ڈی، کا مدارس میں کوئی انتظام نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے طلبہ کو یونیورسٹی کے جدید نظام تعلیم میں جانا پڑتا ہے۔ گویا نہ تعلیم کی ابتداء دینی مدارس کے ہاتھ میں ہے نہ انتہاء بلکہ وہ درمیان میں سے کچھ عرصے کے لیے طالب علم کو اچک لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے طالب علم پر مدرسہ کی زندگی کے فکری اور عملی اثرات نہ تو پختہ ہوتے ہیں اور نہ احسن وعمدہ نتائج مرتب کرتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ ضائع ہو جاتے ہیں اور ان کی اکثریت فکری توانائی سے محروم رہتی ہے حالانکہ اگر دینی مدارس براہ راست یا بالواسطہ ایم فِل اور پی ایچ ڈی لیول کی تحقیق کرائیں تو وہ طلبہ سے ایسے موضوعات پر تحقیق کرا سکتے ہیں جو مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو علمی سطح پر ردّ کرے اور اسلامی تصورات، علوم اور اداروں (خصوصاً فرد کی ذہن سازی کرنے والے ادارے جیسے نظام تعلیم اور میڈیا) کی بازیافت اور تشکیلِ نو اسلامی تناظر میں کر سکے اور سوشل سائنسز کے علوم کی اسلامی تناظر میں تدریس وتحقیق سے مسلم معاشروں اور ریاستوں کو حیاتِ نو کی نوید دے سکے۔

جدید تعلیم

۱۔ عالم اسلام خصوصاً پاکستان میں جدید تعلیم آج بھی لارڈ میکالے کی طے کردہ پالیسی کا تسلسل ہے جس میں استعمار نے مسلمانوں کا نظامِ تعلیم منہدم کر کے اسے مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں پر ازسرنو تعمیر کیا تھا اور جس کے پیش نظر ایسے مسلمان تیار کرنا تھا جو صرف نام کے مسلمان ہوں اور عملاً مغربی فکر وتہذیب کی پیروی کرنے والے ہوں اور ان کی استعماری ریاست کو کل پرزے مہیا کریں۔ جدت (Innovation) اور امامت (Leadershp)

اس کے پیشِ نظر تھی ہی نہیں۔ اس کا بہترین ماڈل علی گڑھ یونیورسٹی تھی چنانچہ آج بھی پاکستان میں جدید تعلیم اسی علی گڑھ ماڈل کے مطابق دی جارہی ہے بلکہ فکری غلامی کو مستحکم رکھنے کے لیے آج بھی مغربی ممالک خود اور ان کے خیراتی ادارے (Donor Agencies) اور غیر سرکاری تنظیمیں (NGOs) پاکستان میں دل کھول کر ڈالر اور یورو اس مقصد کے لیے 'اصلاحِ تعلیم' کے خوبصورت نام پر خرچ کر رہی ہیں۔

۲۔ پاکستان بننے کے بعد بنیادی اہمیت کا کرنے کا اولین کام یہ تھا کہ معاشرے کے ہر شعبے کی عموماً اور تعلیمی نظام کی خصوصاً اصلاح کی جاتی اور اسلامی تناظر میں تشکیل نو کی جاتی لیکن عملاً صرف اتنا ہوا کہ ایک مریل قسم کا مختصر اور غیر موثر اسلامیات کا کورس شامل نصاب کر دیا گیا اور بس۔ ظاہر ہے اس معمولی درخ اندوزی سے لارڈ میکالے کے قائم کردہ نظام تعلیم کو ڈنٹ بھی نہیں پڑا چہ جائیکہ اس میں کوئی موثر تبدیلی آتی۔

۳۔ جب جدید تعلیم کی اصلاح کی بات کی جاتی ہے تو مغرب سے مرعوب بعض ذہن اس کا یہ مطلب لیتے ہیں (اور مغرب زدہ حکمران طبقات اسی بات کو اچھالتے، ابھارتے ہیں اور اسی پر عمل درآمد کی کوشش کرتے ہیں) کہ اپنے نظام تعلیم کو اس اعلیٰ معیار پر لے جائیں جس پر مغرب اسے لے جا چکا ہے اور اس کی بنیاد پر کامیاب اور ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔ اور اگر ان سے نظامِ تعلیم کو اسلامی اصولوں پر مرتب کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو مغرب کے علوم اور تعلیم کو لے کر اور اسے سامنے رکھ کر اس میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے بلکہ ان کی لیپا پوتی، ملمع سازی اور درخ اندوزی (پیچ ورک) کر کے یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ دیکھیے جناب ہم نے موجودہ علوم اور نظامِ تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھال دیا ہے۔ اسے علوم اور نظام تعلیم کی اسلامائیزیشن یا اسلام کاری کا نام دیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے یہ ملمع کاری کسی کام کی نہیں اور اس کے نتیجے میں مغربی ذہن ہی بنے گا اور مغربی اصول واقدار ہی غالب آئیں گے۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ علم و تعلیم

کے میدان میں ہم ان اصولوں اور نظام کو سامنے رکھیں جو ہم نے ماضی کے سنہری دور میں وضع کیا تھا۔ اور آج کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی تعمیر نو و تشکیلِ نو کر لیں۔ اس تشکیلِ نو کے تین رہنما اصول ہونے چاہئیں:

- اسلامی اصولوں اور مقاصد کی پاس داری
- مغربی اصولوں کا ترک اور ردّ
- تعلیم کی ثنویت کا خاتمہ اور اسے ایک موحّد (Integrated) تعلیمی نظام بنانا۔

۴۔ علوم اور تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو کا یہ کام کیسے کیا جائے؟ اس کی تفصیل ہماری کئی تحریروں میں موجود ہے۔ یہاں تلخیصاً عرض کرتے ہیں کہ علوم کی تشکیلِ نو کے وقت اسلامی علوم (یعنی علوم نقلیہ جیسے قرآن وسنت، اور ان کے معاون علوم جیسے فقہ وعربی زبان وغیرہ) کے تدریسی مواد اور اس کی ترجیحات پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور سب سے زیادہ کام تو عمرانی علوم (سوشل سائنسز) میں کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان شعبوں میں قرآن وسنت کے منصوص احکام کی روشنی میں تفصیلی نظام (نُظُم) وضع کیے جا سکیں۔ اس کام میں مغرب کی پیش رفت کو معلومات کے طور پر سامنے ضرور رکھنا چاہیے لیکن اس سے مرعوب ہو کر اس سے اخذ و استنباط نہیں کرنا چاہیے بلکہ اجتہادی فکر سے اپنا راستہ الگ نکالنا چاہیے۔ جہاں تک مغرب کی پیدا کردہ خالص سائنس وٹیکنالوجی کا تعلق ہے، وہ بھی ہماری رائے میں اب معروضی اور بلا اقدار (Value-Neutral) نہیں رہی اور اس میں بھی مسلمان اہل علم کو اپنا راستہ الگ نکالنا چاہیے لیکن یہ سب اتنے بڑے کام ہیں کہ ان کے لیے ساری امت کا فکری اور مالی سرمایہ درکار ہے۔ اس کا مہیا کرنا اور اس کام میں لگ جانا ہی بنیادی چیلنج ہے اور جب امت کو اس کا ادراک ہو گیا تو وہی لمحہ اسے کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے والا ہوگا۔ ہمارے لیے یہی اعزاز کی بات ہے کہ ہم اس کے لیے صدا لگا رہے ہیں اور جو کچھ بن پڑتا ہے کر رہے ہیں۔ اے اللہ جی! قبول فرمایئے اور اسے ہمارے لیے توشۂ آخرت بنا دیجیے۔

۵۔ تربیت: جب ہم علوم اور تعلیم کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد محض تدریس نہیں ہوتا بلکہ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی اس کا جزو لاینفک ہوتی ہے۔ شرعی اصول بھی "**يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ**" کا ہے کہ تعلیم وحکمت مع تزکیۂ نفس ہو۔ عقل ومنطق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ تعلیم کا نتیجہ تعمیر شخصیت اور تعمیر کردار کی صورت میں نکلنا چاہیے۔

اب ہمارے ہاں جدید تعلیم کا پورا نظام چونکہ مغرب زدہ ہے لہٰذا جس طرح تعلیم سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ اصولوں پر مبنی اور غیر اسلامی ہے، ویسے ہی تربیت مغربی اصولوں کے مطابق اور بداہتاً غیر اسلامی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ فکری انتشار، بے عملی بلکہ بدعملی کی صورت میں نکلتا ہے۔ گویا ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مغرب زدہ نظام تعلیم ہماری تربیت غلط رخ میں کر رہا ہے اور ہمارے بچوں کو نا مسلمان بنا رہا ہے جب کہ مسلم معاشرے کی ضرورت یہ ہے کہ اس کی نئی نسل یکسو اور باکردار مسلمان بنے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کا پورا ڈھانچہ (یعنی نصاب، استاد، انتظامیہ، طریق تدریس، درسگاہ کا ماحول وغیرہ) اسلامی تربیت کرنے والا ہو، وہ بچوں کو مسلمان بنانے کا واضح ہدف اپنے سامنے رکھتا ہو اور اس کے سارے ورکنگ پروسیجرز (SOPs) اور قواعد اس طرح کے بنائے جائیں کہ وہ عملاً بچوں کی اسلامی تربیت کریں۔

یہ ایک بڑا چیلنجنگ کام ہے۔ ماضی میں یعنی زوال سے پہلے کے دور میں چونکہ معاشرتی اور تعلیمی ماحول اسلامی تھا لہٰذا بچوں کی تربیت بھی خودکار انداز میں اسلامی تقاضوں کے مطابق ہوتی رہتی تھی۔ اب چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے لہٰذا مسلمان تعلیمی اداروں میں بچوں کی اسلامی تربیت کے لیے نئے ماڈل وضع کرنا ضروری ہیں۔ اس کے لیے اگرچہ مسلم معاشرے کی اجتماعی دانش بروئے کار آنی چاہیے لیکن جب تک حکومتیں اور بڑی دینی جماعتیں اس طرف متوجہ نہیں ہوتیں، فرض کفایہ ادا کرنے کی ایک کوشش ہم نے کی ہے اور 'تعلیمی اداروں میں مسلمان بچوں کی تربیت کیسے کی جائے؟' کے موضوع پر دو کتابیں لکھی

ہیں جو اسلامی تربیت کا کام کرنے والوں کے لیے کچھ نہ کچھ سامان تفکر مہیا کرتی ہیں۔

مسلمانوں نے بڑی عمر کے لوگوں (Grown ups) کی تربیت وتزکیہ کے لیے تصوف کے نام سے جو ادارہ بنایا تھا اس میں مسلم علماء اور محقق صوفیاء نے گراں قدر تحقیقی تجربات کیے ہیں اور نفس انسانی کی تربیت واصلاح کے لیے تفصیلی قواعد مرتب کیے ہیں۔ آج بچوں کی اسلامی تربیت کے لیے نیا ماڈل بناتے وقت ماضی کے اس کام کو سامنے رکھنا بھی ضروری اور مفید ہے۔ گو ظاہر ہے کہ ان قواعد کا اطلاق بعینہٖ آج کے بچوں پر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایک تو وہ بچوں کے لیے وضع نہیں کیے گئے اور دوسرے آج بچوں کی جو ذہنی ساخت ہے وہ ماضی سے مختلف ہے لہٰذا ماضی کے اس سرمائے کو سامنے تو رکھنا چاہیے اور اس سے استفادہ تو ضرور کرنا چاہیے لیکن اسے بعینہٖ نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح مغرب کے تصور اخلاق اور تصور تربیت کو معلومات کی حد تک دیکھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن چونکہ مغربی تہذیب کی بنیاد الحاد پر ہے اور آخرت کی بجائے اس کے پیش نظر صرف دنیا ہے، لہٰذا اس کی پیروی ہمارے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے مضر اثرات سے بچنا ضروری ہے۔

۷۔ تحقیق

اسلام میں تحقیق کا دائرہ کار کیا ہے؟ ہم نے اس سے کیسے منہ موڑا ہے؟ اس کے نتائج کیا نکلے ہیں؟ کیا مغرب تحقیق کی وجہ سے ہم سے آگے نکل گیا ہے؟ اور اب اگر ہم صورتِ حال کی اصلاح کرنا چاہیں تو ہمارا رخ اور منہج کیا ہونا چاہیے؟ ان سوالات کا جواب ایک خلاصے کی صورت میں یہ ہے:

چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نبوت ختم کرنے کا اعلان کیا تو اس کا انتظام کرنا ضروری تھا کہ اسلام قیامت تک آنے والے زمان ومکان کے لیے قابل عمل رہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ قرآن حکیم کی حفاظت کا ذمہ خود لیا،

آپ ﷺ کی نبوت کو سارے عالم کے لیے قرار دیا اور اپنی ہدایت کا اسلوب یہ رکھا کہ عقائد، عبادات اور اخلاق کے لیے ٹھوس، حتمی اور نا قابل تغیر احکام عطا کیے تا کہ انسانی معاشرہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہو جائے۔ پھر معاملات کا شعبہ چونکہ تغیر پذیر تھا اس لیے شارع نے یہاں یہ اسلوب اختیار فرمایا کہ بنیادی، حتمی اور نا قابل تغیر پالیسی اصول مرحمت فرما دیے اور تفصیلات کا تعین امت (کے اہل علم) پر چھوڑ دیا کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد کر لیں۔ گویا قرآن وسنت کے بعد اب اجتہاد ہی وہ بڑا دائرہ تحقیق ہے جو شریعت اسلامی کو ہمیشہ کے لیے قابل عمل رکھ سکتا ہے۔

عصر حاضر میں اجتہاد وتحقیق کا سکوپ

اسلامی فکری روایت میں اجتہاد کے تین بڑے دائرے ہیں:

۱۔ نصوص قرآن وسنت کی تفہیم، تشریح اور عملی اطلاق

۲۔ عمرانی علوم میں منصوص پالیسی امور کی روشنی میں تفصیلی نظام وضع کرنا۔

۳۔ تمدنی ترقی کی وجہ سے نو پیش آمدہ امور (محدثات ونوازل) میں حکم شرعی کی دریافت، نصوص قرآن وسنت سے اخذ واستنباط کرتے ہوئے اور مقاصد شریعت کی روشنی میں۔ نیز خالص سائنسی امور میں تسخیر کائنات اور جدید اکتشافات۔

جس زمانے کو مسلمانوں کا عروج کا سنہری دور کہا جاتا ہے اس میں جہاں ایک طرف تمسک بالقرآن والسنۃ پر پورا زور تھا تو وہیں اجتہاد وتحقیق کے ان شعبوں میں بھی وفور نظر آتا ہے۔ اور مسلمانوں نے اگر بارہ سو سال تک معلوم دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی ہے تو وہ میرٹ پر کی ہے اور مسلمان اُس وقت اجتہاد وتحقیق کے ان شعبوں میں بھی سب سے آگے تھے۔

مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ تمسک بالقرآن والسنۃ میں کمی تھی، اس کے نتیجے میں صلاحیتیں دب گئیں اور اجتہاد وتحقیق میں بھی مسلمان پیچھے رہ گئے۔ اب اگر ہم زوال کے

گڑھے سے نکلنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے جہاں تمسک بالقرآن والسنۃ شرط ہے وہیں اجتہاد و تحقیق میں پیش رفت بھی شرط ہے۔لیکن ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ جو دینی مدارس مغربی استعمار کے غلبے کے نتیجے میں پروان چڑھے،انہوں نے دورِ استعمار کی عارضی صورتِ حال کو مستقلاً اختیار کر لیا اور وہ بھول گئے کہ ان کے اسلاف نے جو مدارس اور جامعات قائم کی تھیں ان میں ایک ہی موحد (Integrated) نظام تعلیم تھا جو قرآن و سنت اور ان کے معاون علوم کی تعلیم بھی دیتا تھا اور اجتہاد و تحقیق کے مذکورہ تین دائروں کے لیے بھی آدمی تیار کرتا تھا۔ جہاں تک جدید تعلیم کا حال ہے وہ مغرب زدہ ہے اور آج بھی استعمار کے قائم کردہ خطوط پر قائم ہے۔اس میں نہ تو قرآن و سنت سے تمسک کا اہتمام ہے اور نہ وہ نصوص قرآن و سنت کی روشنی میں تحقیق و اجتہاد کے دائروں میں کام کرنے کے لیے افرادِ کار تیار کرتا ہے۔جو افراد اس مغرب زدہ نظام تعلیم کے ذریعے تیار ہوتے ہیں وہ اپنی علمی معراج اسی میں سمجھتے ہیں کہ مغرب اور اس کے علوم و افکار کی جگالی اور خوشہ چینی کرتے رہیں۔یہی وجہ ہے کہ مسلمان زوال کے گڑھے سے نہیں نکل پا رہے۔لہٰذا امت مسلمہ کی فوری ضرورت یہ ہے کہ اس کا نظام تعلیم ایسے افراد تیار کرے جو تمسک بالقرآن والسنۃ کے ساتھ ساتھ تحقیق و اجتہاد کے سارے مذکورہ دائروں میں بھی کام کرنے کی اہلیت اپنے اندر رکھتے ہوں۔

میڈیا

کچھ اہل علم کی رائے یہ ہے کہ موجودہ مغربی میڈیا ٹیکنالوجی کا زیادہ تر استعمال نہ صرف اسلامی تعلیمات و اقدار کو منہدم کرنے والا ہے بلکہ ہر طرح کے مذہبی اور اخلاقی ترفع میں بھی مزاحم ہے لہٰذا اس کا ترک اور اس سے اجتناب ضروری ہے۔اس کے برعکس علماء کی بہت بڑی اکثریت موجودہ میڈیا کو اس کی خرافات کے باوجود اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی حامی ہے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ میڈیا آج بہت موثر ہو گیا ہے اور وہ لوگوں

کے فکر و عمل کو شدید طور پر متاثر کر رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا اکثر استعمال غیر تعمیری اور تخریبی ہے اور تعمیری کم ہے اور وہ مسلم افراد خصوصاً ان کی نئی نسل کی بہت بری تربیت کر رہا ہے اور انہیں نا مسلم بنا رہا ہے لیکن ان علماء کرام کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ ہم اس میڈیا کو اسلامی تناظر میں اور اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کریں نہ کہ اس سے غیر متعلق ہو جائیں کہ وہ مسلمانوں کو بگاڑتا رہے اور ہم چپ کر کے انہیں بگڑتا دیکھتے رہیں۔ لہٰذا ان کے نزدیک بہتر طرزِ عمل یہ ہے کہ علماء کرام اور اساتذہ میڈیا، (خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو، الیکٹرانک میڈیا ہو یا سوشل میڈیا ہو) میں بھرپور دلچسپی لیں اور اسے اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کریں۔

یہ دوسرا نقطۂ نظر جیسا کہ ہم نے کہا کہ علماء کرام کی اکثریت کا ہے لہٰذا اس کا نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیے تھا کہ مسلم اہل خیر اس طرف متوجہ ہوتے اور میڈیا کو اسلامی مقاصد کے لیے بھرپور انداز میں استعمال کرتے لیکن بدقسمتی سے اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلا۔ کچھ دینی لوگوں نے میڈیا کا استعمال اپنے مسلک کو فروغ دینے کے لیے کیا ہے تو کچھ نے تجدد اور مغرب و بھارت سے خوشہ چینی کا رویہ اختیار کر لیا ہے۔ کچھ حکومتوں کی مدح سرائی میں مصروف ہیں تو کچھ ذاتی رونمائی میں۔ پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے موثر دینی استعمال کے لیے جس طرح کی تعمیری کوششوں کی ضرورت ہے وہ بہت کم نظر آتی ہیں۔ ہم علماء کرام، اسلامی سکالرز اور دینی جماعتوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس طرف توجہ فرمائیں اور میڈیا کے محاذ کو اسلامی مقاصد کے لیے موثر طور پر استعمال کرنے کے لیے پلاننگ کریں۔

ہماری رائے میں یہ کام بہت اہم ہے اور نہ صرف پاکستان بلکہ پوری امت کی سطح پر کرنے کا ہے اور دیکھا جائے تو نہ پاکستان میں اسلامی ذہن کے سرمایہ داروں اور سرمایہ کاروں کی کمی ہے اور نہ عالم عرب اور عالمِ اسلام میں۔ اسی طرح ایسے ادیبوں، مصنفوں، پروڈیوسروں اور ماہرین انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بھی کمی نہیں جو اسلامی تناظر میں اور اسلامی

اقدار کے فروغ کے لیے بچوں کے کارٹون، ڈرامے اور فلمیں تیار کریں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ کچھ ایسے مخلص لوگ اٹھ کھڑے ہوں جن کو میڈیا کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا درد ہو اور وہ متعلقہ افراد کو اس سلسلے میں متحرک کر سکیں۔علماء کرام کو نہ صرف اس طرح کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے بلکہ لوگوں کو اس پر آمادہ بھی کرنا چاہیے تاکہ مغرب اور مغرب پرست افراد نے اسلامی تعلیمات اور اقدار کے خلاف جو محاذ کھڑا کر رکھا ہے، اس کے نقصانات سے بچنے کی کوئی صورت تو پیدا ہو اور اسلامی تعلیمات اور اقدار کے فروغ کے لیے کچھ تو کیا جا سکے۔

مقننہ

مقننہ یعنی قانون ساز ادارے اور قانون سازی مغربی تصورات اور اصطلاحات ہیں جو مغرب کی سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کا لازمی حصہ ہیں اور پارلیمنٹ کے ارکان جمہور عوام کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے ریاست کا دستور اور قوانین بناتے اور ان میں تبدیلی کرتے ہیں۔اسلام اور مسلم روایت میں یہ تصورات سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہاں قانون کی بجائے 'حکم شرعی' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے کیونکہ انسان اور کائنات کا خالق، ہادی اور حاکم (بالفعل اور قانونی لحاظ سے) اللہ تعالیٰ ہے۔لہٰذا 'جو حکم' اللہ تعالیٰ دیتا ہے وہ قانون ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے 'احکام' پیغمبر پر وحی کے ذریعے نازل فرماتا ہے جو ہمارے پاس قرآن (وسنت) کی صورت میں موجود ہیں۔مسلمانوں اور ان کے علماء (مجتہدین) کا اختیار ان احکام الٰہیہ کی تفہیم وتشریح، عملی زندگی میں ان کے اطلاق اور نو پیش آمدہ امور میں جہاں حکم شرعی صراحتاً موجود نہ ہو وہاں قرآن وسنت کے احکام اور ان کے مقاصد کی روشنی میں حکم شرعی کی دریافت تک محدود ہے۔اس عمل یا پروسیس کو 'اجتہاد' کہا جاتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اس میں حصہ لینے والے قرآن وسنت اور عربی زبان کے ماہر ہوں، اجتہاد کی مسلم روایت اور اس کے علم (یعنی فقہ واصولِ فقہ) میں درک رکھتے ہیں،

اس کام کی صلاحیت اور ملکہ رکھتے ہوں، جن نئے امور (محدثات ونوازل) میں حکم شرعی کی دریافت مقصود ہو وہ ان کی نوعیت اور اسباب ومظاہر کو سمجھتے ہوں، اور متقی ہوں تاکہ لوگ ان کے کردار پر اعتماد کر سکیں۔ [اگر عصر حاضر کے کسی ملک میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل نو ہو تو اس میں کبار علماء واسلامی سکالرز پر مشتمل ایک مجلس اجتہاد بننی چاہیے، جن کی معاونت کے لیے دین دار وکلاء کی ایک ٹیم ہو اور یہ مجلس محدثات ونوازل میں حکم شرعی کا تعین کرے اور نئے قواعد وضوابط تشکیل دے]۔

ظاہر ہے یہ صفات جدید جمہوریت کے ارکان پارلیمنٹ میں نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ان کے لیے لازمی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا حل پاکستان میں دستور سازوں نے یہ نکالا ہے کہ ایک اسلامی نظریاتی کونسل قائم کر دی ہے جس میں علماء کرام کو نمائندگی دی گئی ہے جن سے پارلیمنٹ اور حکومت اسلامی امور میں رہنمائی لے سکتی ہے لیکن دستور نے اس کونسل کا کردار مشاورتی رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ غیر اہم ہو گئی۔ حکومتیں اس کونسل کی سفارشات کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں اور نہ ان کے مطابق قانون سازی کرتی ہیں۔

اگر نیت ہو تو موجودہ سسٹم کے اندر رہتے ہوئے بھی اس کے کئی حل نکالے جا سکتے ہیں مثلاً دستوری ترمیم کے ذریعے اسمبلی ۱۰ (دس) علماء کرام کو بطور رکن اسمبلی منتخب کر لے (جیسا کہ خواتین اور ٹیکنو کریٹس کا انتخاب اِس وقت ہوتا ہے) ان پر مشتمل قانون سازی کی قائمہ کمیٹی بنا دی جائے اور اس کی تائید کے بغیر کوئی قانون سازی نہ کی جائے۔ یا موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل ہی کو با اختیار بنا دیا جائے اور اس کی سفارشات پر عمل درآمد اسمبلی کے لیے لازمی قرار دے دیا جائے یا مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ساتھ علماء کا ایک بورڈ بنا دیا جائے جس کی سفارشات پر عمل لازمی ہو....) لیکن مغربی جمہوریت (یا اس برائے نام 'اسلامی جمہوریت' میں جو اصلاً اور مزاجاً مغربی جمہوریت ہی ہے اور بعض اسلامی اصولوں کی اس میں محض درخ اندوزی اور پیچ ورک کر دیا گیا ہے) کا مزاج ایسا ہے اور اس میں عوامی

نمائندوں، پارلیمنٹ اور آئین کی بالادستی کے تصورات ایسے ہیں جو اسلامی شریعت اور اس کے علماء یا اسلامی سکالرز کی بالادستی کو تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں۔ نہ حکمران طبقات (سیاستدان، عدلیہ، فوج، بیورکریسی وغیرہ) کی تعلیم وتربیت اور ان کا مزاج ایسا ہے کہ وہ اسلامی شریعت اور اس کے ماہرین کی بالادستی کو تسلیم کریں جبکہ وہ خود اس کی صلاحیت نہیں رکھتے۔لیکن دینی قوتیں اگر پاکستان کو اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست بنانا چاہتی ہیں اور اس میں اپنے کردار کو مؤثر بنانا چاہتی ہیں تو انہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا اور انہیں اصلاح احوال کے لیے کچھ نہ کچھ تو طے کرنا ہوگا کیونکہ اسلامی لحاظ سے قانون سازی کی موجودہ صورتِ حال قابل قبول نہیں ہے اور نہ دینی قوتوں کے لیے قابل قبول ہونی چاہیے۔

انتظامیہ (ایگزیکٹو اور بیوروکریسی)

چونکہ مغربی فکر وتہذیب اور اس کے علمبردار ممالک اس وقت دنیا پر غالب ہیں لہٰذا ساری دنیا کے لوگوں کی بشمول مسلم معاشرے اور ممالک ، انفرادی زندگی کے عقائد و نظریات اور اجتماعی زندگی کا ڈھانچہ (یعنی سیاسی نظام، معاشی نظام، تعلیمی نظام....وغیرہ) یا تو مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہیں یا اس سے مرعوب ومتاثر ہیں۔مغرب کے سیاسی نظام کے اہم اجزاء نیشنلزم، نیشن سٹیٹ اور جمہوریت ہیں۔ مغربی جمہوریت سے مراد ہے اس کا ہیومنزم پر مبنی ہونا (یعنی خدا کا انکار کر کے انسان کو خدا کی جگہ دینا) اور اس کا سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہونا۔نیشنلزم اور نیشن سٹیٹ کا مطلب یہ ہے کہ قوم (اور ریاست) زمین، زبان، نسل اور رنگ سے بنتی ہے نہ کہ کسی نظریے سے۔

مغربی فکر وتہذیب اور اس کے مذکورہ بالا سیاسی نظریات کا غیر اسلامی ہونا واضح تھا (اور ہے) لیکن چونکہ نوزائدہ مسلم ممالک کے حکمران مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب تھے اور اسی کو اپنانا چاہتے تھے اور علماء کرام ودینی جماعتوں نے بھی سہولت اسی میں سمجھی کہ سسٹم کے اندر رہ کر اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے لہٰذا انہوں نے مغربی جمہوریت میں کچھ

اسلامی اصول داخل کر کے اسے مشرف بہ اسلام کر لیا اور اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا لیکن مغرب کے دباؤ اور اپنی خواہش نہ ہونے کی وجہ سے مسلم حکمرانوں نے پاکستانی معاشرے اور ریاست کو حقیقی معنوں میں اسلامی بنانے کے لیے کچھ نہیں کیا اور اجتماعی ڈھانچہ (سیاسی نظام، معاشی نظام، تعلیمی نظام....) مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار کے مطابق کام کرتا رہا اور اب تک کر رہا ہے۔

پاکستان میں حکومتی ڈھانچہ کی سربراہی خواہ صدر کے پاس ہو (جیسے ایوب خان کے صدارتی نظام میں تھی) یا وزیر اعظم کے پاس ہو (جیسے پارلیمانی نظام میں ہے) یا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے پاس ہو (جیسے فوجی حکومتوں میں) گورننس کا برا حال رہا ہے اور اسلامی مقاصد سے ہمیشہ دور رہا ہے۔ سیاستدانوں نے اہلیت کی کوئی شرط کبھی تسلیم نہیں کی (ایک دفعہ جنرل پرویز مشرف نے بی اے کی شرط رکھی تو بہت سے لوگ باہر رہ گئے اور بہت سے جعلی ڈگریاں لے کر پارلیمنٹ میں پہنچ گئے) چنانچہ اس کے بعد سیاسی حکومت آئی تو یہ شرط بھی ختم کر دی گئی۔ اور اگر اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کی شرط رکھ دی جائے تو جیسا کہ ایک دفعہ سپریم کورٹ کے ججز نے ریمارکس دیے تھے کہ سارا پارلیمان خالی ہو جائے۔ جنرل ضیاء الحق نے آئینی ترمیم کر کے ارکان اسمبلی کے لیے اعلیٰ اخلاقی اوصاف کی شرط رکھ دی تھی لیکن حکمران ان شرائط کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں چنانچہ اب بھی پاکستانی پارلیمنٹ کے ارکان، جن میں سے وزراء منتخب ہوتے ہیں اور حکومت چلاتے ہیں، اسلامی تعلیم و تربیت اور اخلاقِ عالیہ کی شرائط پر پورے نہیں اُترتے البتہ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے لیے اپنے مخالفوں کو آئین کی دفعہ ۶۱، ۶۲ کے تحت نااہل کرواتے رہتے ہیں۔ احتساب اور کرپشن روکنے کے لیے بھی ادارے بنے ہوئے ہیں لیکن ان سے بھی عموماً سیاسی مخالفین ہی کو زچ کیا جاتا ہے۔ نظام تعلیم و تربیت کے ذریعے اور اخلاقی اور اسلامی معیار کے لیے کوئی حکمران کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ سیاستدانوں نے حکمرانی اور سیاست کو

کاروبار بنا رکھا ہے۔ وہ کروڑوں خرچ کر کے حکومت میں آتے ہیں اور اربوں کی کرپشن کر کے اپنی جیبیں بھرتے رہتے ہیں۔

بیوروکریسی

پاکستان میں قانونی حکمران سیاستدان یا فوجی جنرل ہوتے ہیں لیکن حقیقی حکمران، جو دراصل حکومت چلاتے ہیں، وہ بیوروکریٹ ہیں۔ بیوروکریسی کی تعلیم وتربیت کا نظام آج بھی وہی ہے جو انگریزی دور میں تھا چنانچہ بیوروکریٹوں کی ذہنیت اب بھی وہی ہے جو پہلے ہوتی تھی یعنی عوام کو غلام سمجھنا، ان کے مسائل حل نہ کرنا، رشوت لینا اور حکمرانوں کے ساتھ مل کر کرپشن کرنا۔ سیاستدان عموماً اَن پڑھ یا صلاحیتوں سے عاری ہوتے ہیں اور جرنیلوں کی تربیت بھی سیاسی نہیں ہوئی ہوتی اور نہ ان کی اخلاقی تربیت ہوئی ہوتی ہے لہٰذا فوجی حکومت میں بھی بیوروکریسی ہی کی مرضی چلتی ہے اور چونکہ بیوروکریسی کی تعلیم وتربیت میں اسلامی اصولوں کا دخل نہیں لہٰذا ان سے اسلامی اقدار کے تحفظ وفروغ کی توقع رکھنا عبث ہے۔

حل: ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم وتربیت کے نظام کو اسلامی اصولوں پر استوار کیا جائے، جدید تعلیم کو اسلامی بنایا جائے اور دینی مدارس بھی دنیاوی علوم کی اعلیٰ درجے کی تعلیم دیں تاکہ سیاست کرنے اور بیوروکریسی میں جانے کے لیے مناسب افراد تیار ہو سکیں۔ مقابلے کے امتحان اردو میں ہوں اور انگریزی صرف بطور مضمون ہو۔ پھر جو لوگ بنیادی اہلیت کی شرط پوری کریں، ان کی خصوصی فنی اور اخلاقی تربیت کی جائے۔ اگر ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لیے کئی سال کی فنی تعلیم وتربیت ضروری ہے تو جن سیاستدانوں یا بیوروکریٹوں نے ملک چلانا ہے ان کے لیے خصوصی تعلیم وتربیت کیوں ضروری نہیں؟ عوامی نمائندگی کے قوانین میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ کوئی نااہل شخص پارلیمنٹ میں نہ پہنچ سکے۔ پارلیمنٹ میں غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کی اکثریت ہونی چاہیے۔ وہاں مزدور اور کسان بھی ہونے چاہئیں اور علماء کی قابل ذکر تعداد بھی وہاں پہنچنی

چاہیے تا کہ قانون سازی یعنی اجتہاد اسلامی اصولوں کے مطابق ہو سکے۔

عدلیہ

مغرب کے سیاسی فلسفے اور جمہوریت میں ریاست کا جو کردار سامنے آتا ہے اس کا کچھ ذکر سطور بالا میں ہو چکا۔ اس پر عدلیہ کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے جسے ریاست کا ایک بنیادی ستون کہا جاتا ہے۔ مغربی جمہوریت میں ریاست کا نظام آئین کی بنیاد پر چلتا ہے جو عوامی نمائندوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے اور عوام کی حاکمیت اعلیٰ کا مظہر ہوتا ہے۔ چنانچہ عدلیہ بھی سارے فیصلے آئین کے مطابق کرتی ہے اور اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے زیریں عدالتوں پر حجت ہوتے ہیں۔

مغربی جمہوریت میں درخ اندوزی (پیچ ورک) کا جو کام ''اسلامی جمہوریت'' کے نام پر پاکستان میں ہوا اس میں، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، مزاج مغربی جمہوریت ہی کا غالب ہے اور اسلامی اصول جہاں اس سے ٹکرائیں، ان کی تاویل کر لی جاتی ہے یا ان سے صَرفِ نظر کر لیا جاتا ہے لیکن عمل بہرحال مغربی جمہوریت اور مغربی آئین وقانون ہی پر کیا جاتا ہے چنانچہ ملک کے لاء کالجوں میں مغربی (اور پاکستانی) قانون ہی پڑھایا جاتا ہے، اسی کی پریکٹس وکلاء کرتے ہیں، اسی کی تشریح اور اس پر عمل درآمد جج کرتے ہیں۔ اعلیٰ عدلیہ کے جج بھی انہی وکلاء سے لیے جاتے ہیں۔ اسلامی شریعت اور قانون میں مہارت نہ وکلاء کو ہوتی ہے اور نہ ججوں کو، نتیجتاً فیصلے آئین کے مطابق ہوتے ہیں نہ کہ قرآن وسنت کے مطابق۔ اور جہاں ملکی قانون اور شریعت اسلامی میں تصادم ہو وہاں فیصلے آئین کے مطابق کیے جاتے ہیں (یہ فرض کر کے کہ آئین اسلامی ہے، خواہ وہ عملاً نہ ہی ہو۔ اس کی نمایاں مثال توہین رسالت کے قانون پر عمل درآمد کی ہے۔ ممتاز قادری کیس میں دہشت گردی کی ابتدائی عدالت کے جج نے فیصلے میں تسلیم کیا کہ ملزم نے شاتم رسول کو قتل کر کے شرعی لحاظ سے کوئی جرم نہیں کیا لیکن مَیں پاکستان میں مروج دہشت گردی کے قوانین کے تحت اسے

سزائے موت دیتا ہوں۔ یہ کیس جب سپریم کورٹ میں پہنچا تو ججوں نے اپنی ابزرویشن میں کہا کہ کیوں نہ کیس وفاقی شرعی عدالت کو ریفر کر دیا جائے کیونکہ ہم تو شریعہ کے ماہر جج نہیں ہیں۔ لیکن اس ابزرویشن کے چند دن بعد انہوں نے آئینِ پاکستان کے تحت ممتاز قادری کو پھانسی کی سزا کی توثیق کر دی۔

مقننہ نے قرارداد مقاصد کو، جو دستور کا اسلامی چہرہ ہے، آئین کے دیباچے کے طور پر رکھا اور اسے قابل عمل آئینی دفعات میں شامل نہیں کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے آئینی ترمیم کے ذریعے اسے آئین کے متن کا حصہ بنا دیا تو بھی سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا کہ یہ دفعہ آئین کی باقی دفعات پر حاوی نہیں ہے۔ چنانچہ اسلام کے حق میں آئین میں متعدد دفعات موجود ہیں لیکن اس کے باوجود واضح طور پر یہ نہیں لکھا گیا کہ عدلیہ فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کرے گی۔

دستور کی ایک مضحکہ خیز صورت یہ بھی ہے کہ شرعی امور کے لیے ایک وفاقی شرعی عدالت بنائی گئی ہے جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ باقی ساری عدلیہ اسلامی نہیں ہے۔ اس وفاقی شرعی عدالت کو غیر موثر بنانے کے بھی سو حیلے موجود ہیں چنانچہ ان سطور کے لکھتے وقت (نومبر ۲۰۱۹ء) میں اس عدالت کے سارے جج (سوائے ایک کے)، بشمول چیف جسٹس، وہ ہیں جو شریعت اسلامی کے ماہر نہیں ہیں بلکہ ان کی اکثریت ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ ججوں کی ہے یا ہائی کورٹ کے کسی جج کو بطور سزا کھڈے لائن لگانا ہو تو اس کی پوسٹنگ شرعی عدالت میں کر دی جاتی ہے۔

حل: موجودہ سیاسی اور آئینی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے عدلیہ کے کردار کو مطابق اسلام بنانے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کرنا چاہیے:

۱۔ قانون کی تعلیم کے موجودہ نہج کو بدلا جائے۔ ایل ایل بی اور ایل ایل ایم کے نصاب کے تین حصے ہونے چاہئیں: ۱۔ اسلامی قانون ۶۰ فیصد ۲۔ مغربی قانون ۳۰ فیصد

۳۔ اسلامی اور مغربی قانون میں تقابلی مطالعہ اور مغربی قانون کا اسلامی تناظر میں تنقیدی جائزہ ۱۰ فیصد۔ حصہ اوّل میں عربی زبان کا سیکھنا لازمی ہونا چاہیے۔

۲۔ قانون کے طلبہ کی اسلامی تربیت پر زور

۳۔ پاکستان کے نظام عدل میں وکلاء کا موجودہ کردار غیر اسلامی ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے اقدامات ناگزیر ہیں۔

۴۔ موجودہ وکلاء اور ججز کی اسلامی قانون میں تعلیم وتربیت

۵۔ آئین کی اصلاح اور تبدیلی جس میں واضح طور پر لکھ دیا جائے کہ ہر سطح کی عدالت کے فیصلے لازماً قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے اور مسلمان جج ہی یہ فیصلے کریں گے۔

۶۔ وفاقی شرعی عدالت کو ختم کر کے ساری عدالتوں کو اسلامی بنا دیا جائے۔

۷۔ اسلامی نظام عدل کا تقاضا ہے کہ انصاف سستا ہو اور فوری ہو۔ اس کے لیے کورٹ فیس ختم ہونی چاہیے اور فیصلے جلد ہونے چاہئیں۔

۸۔ مقدمہ بازی میں پڑنے کی بجائے ثالثی اور صلح کی عوامی عدالتوں کا ملک بھر میں جال پھیلا دیا جائے جو مسجد کو بنیاد بنا کر کام کر سکتی ہیں۔

فوج

فوج کی تعلیم وتربیت اور ورکنگ بھی انہی غیر اسلامی خطوط پر جاری ہے جن کی بنیاد انگریز استعمار نے رکھی تھی۔ چنانچہ فوج کے تربیتی اداروں میں اسلامی تناظر برائے نام ہے اور فوجی افسروں کا رہن سہن اور میس میں شراب نوشی وغیرہ معمول کی باتیں سمجھی جاتی تھیں۔ جنرل ضیاء الحق نے اس میں کچھ تبدیلی لانے کی کوشش کی تھی۔ سیاسی اقتدار کا چسکا بھی فوجی قیادت کو آئین شکنی پر آمدہ کرتا رہتا ہے۔ نچلی سطح پر سپاہی اگرچہ اسلامی جذبہ جہاد سے سرشار ہوتے ہیں لیکن یہ سپرٹ اوپر آتے آتے ہلکی ہوتی جاتی ہے خصوصاً جن آفیسرز کو امریکہ ویورپ میں ٹریننگ کے لیے بھیجا جاتا ہے ان میں سے اکثر کے مغربی ایجنسیوں کے دام فریب میں

آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں جو ملک وملت میں فساد کا سبب بنتے ہیں۔

چنانچہ بہت سے تجزیہ کاروں کی رائے ہے کہ جنرل مشرف کو افغانستان میں امریکہ کے منصوبوں کی حمایت کے لیے لایا گیا اور فوج کو امریکی مفادات کی نگرانی کے لیے استعمال کیا گیا اور جب یہ رجحان طے پا گیا تو ایسی سول حکومت لائی گئی جو انہی خطوط پر کام کرنے کے لیے تیار ہو۔ زرداری صاحب اپنی ہوشیاری اور بے اصولی میں مہارت کی وجہ سے عرصۂ اقتدار پورا کرنے میں کامیاب رہے جبکہ میاں نواز شریف تابعداری کے معیار پر پورے نہ اُترے اور انہیں چلتا کر دیا گیا اور ان کے بعد ایسی سول حکومت لائی گئی جو اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ایک پیج پر ہے۔

حل: فوج کے نظام تعلیم وتربیت کو اسلامی بنایا جائے۔ افسروں کے لائف سٹائل کو اسلامی تعلیمات واقدار کا پابند بنایا جائے۔ فوج کو مغربی اور امریکی اثر ورسوخ سے نکالا جائے۔ سیاسی چسکے سے اس کی جان چھڑائی جائے اور اسے ایک پروفیشنل آرمی بنایا جائے۔ دینی مدارس اپنے طلبہ کو اس قابل بنائیں کہ وہ فوج میں کمشن لینے کے کے اہل ہوں۔

معیشت

مسلمان ملکوں خصوصاً پاکستان میں افلاس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران اخلاص اور فراست سے عاری ہیں۔ ملک میں نہ اجناس کی کمی ہے اور نہ معدنی وسائل کی۔ کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ ہمارے حکمران اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔ ہمارے معاشی ماہرین مغربی معیشت پڑھتے ہیں۔ مغربی اداروں خصوصاً بڑے بین الاقوامی مالیاتی اداروں (جیسے آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک) میں کام کرتے ہیں، پھر انہی کی وساطت سے (اور بعض اوقات انہی کی تنخواہ پر) انہیں پاکستان کی معیشت کا کرتا دھرتا بنا کر بھیج دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آقایانِ ولی نعمت کے منصوبوں کو یہاں لاگو کرتے ہیں۔

اہل مغرب نے سازش سے مسلم حکمرانوں کو قرضے دیے، پھر انہیں ترغیب دی کہ وہ ان

کو غیر پیداواری مدّوں میں اور اللّے تللّے سے خرچ کریں، سودی نظام کو اپنائیں جو امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بناتا ہے، سرمایے کا ارتکاز چند خاندانوں میں کرتا ہے اور غریب عوام نانِ جویں کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ مغرب مسلم ماہرینِ معیشت سے ایسی پالیسیاں بنواتا ہے جن سے وہ مغربی ٹیکنالوجی کی End Product کے خریدار بنے رہیں اور خود کبھی اپنے پیروں پر کھڑے نہ ہو سکیں۔ مغرب مسلم ممالک کو نہ صرف یہ کہ ہیوی انڈسٹری لگانے میں مدد نہیں دیتا بلکہ انہیں جدید ٹیکنالوجی کی منتقلی بھی نہیں کرتا اور انہیں معدنیات کی کان کنی (جیسے تیل گیس وغیرہ) میں بھی خود کفیل نہیں ہونے دیتا کہ انہیں خوشحالی نصیب ہو بلکہ الٹا بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ذریعے مسلم ممالک میں مہنگائی کرتا ہے، روز مرہ استعمال کی چیزوں کی قیمتیں بڑھواتا ہے تا کہ مسلمان عوام نانِ جویں کو ترسیں، لوگ بھوکے مریں، خودکشیاں کریں اور حکمرانوں اور عوام میں نفرت پیدا ہو۔

مغرب اپنے ان سارے معاشی منصوبوں میں کامیاب ہے کیونکہ ہمارے حکمران اخلاص سے بھی عاری ہیں اور فراست سے بھی۔ وہ نہ اپنے اللہ کے ساتھ مخلص ہیں اور نہ ملک اور عوام کے ساتھ۔ وہ صرف اپنی ذات کے لیے مخلص ہیں کہ وہ اقتدار میں رہ سکیں اور اقتدار میں رہ کر مال بنا سکیں۔

اسلام کی معاشی تعلیمات پر عمل ان حالات میں ممکن ہی نہیں۔ نہ کوئی مسلم حکمران ان پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ سارے مسلمان ممالک مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے پیروکار ہیں، اسی میں مگن ہیں اور اسی میں اپنی اصلاح اور ترقی کے خواب دیکھتے ہیں۔ مغرب کی یونیورسٹیوں میں پڑھے اور وہاں کے اداروں میں تربیت پائے ہوئے مسلمان معاشی ماہرین کا ذکر ہم سطورِ بالا میں کر چکے، جہاں تک علماء کرام کا تعلق ہے وہ نہ دینی مدارس میں 'اسلام کا معاشی نظام' پڑھتے پڑھاتے ہیں، نہ انہیں انگریزی آتی ہے (اور نہ وہ اپنے طلبہ کو انگریزی پڑھاتے ہیں) کہ وہ مغرب کے معاشی نظام کا مطالعہ کریں چنانچہ وہ مسلم

معاشرے کے معاشی نظام کی اسلامی تشکیلِ نو میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔ وہ بس اپنے وعظوں میں سود کے خلاف تقریریں کر سکتے ہیں، جن کا عملاً کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

ہاں! علم معاشیات پڑھنے پڑھانے والے مسلمان پروفیسروں میں سے کچھ نے (جیسے پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ڈاکٹر عمر چھاپرا وغیرہ) اور ایک آدھ عالم دین نے (جیسے مفتی تقی عثمانی صاحب) نے 'اسلامی معیشت' اور اسلامی بنکنگ کا نعرہ ضرور لگایا ہے جس کا مآل یہ ہے کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں کچھ اسلامی اصولوں کی درخ اندوزی (پیچ ورک) کر کے اسے اسلامی قرار دیا جائے۔ یہ مغرب کی الحادی فکر و تہذیب اور اس کے کفریہ نظام سرمایہ داری کے ساتھ مفاہمت (Rconciliation) کی ویسی ہی کوشش ہے جیسی جدید دینی تحریکوں کے قائدین اور بعض علماء کرام نے مغرب کی الحادی جمہوریت میں کچھ اسلامی اصولوں کی پیوند کاری کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے کر کی تھی۔ جس طرح 'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے پاکستان میں اسلام نہیں آیا بلکہ سیکولرزم اور لبرل ازم آیا ہے، اسی طرح مغربی بنکنگ میں کچھ اسلامی اصول داخل کرنے سے اسلام کا مالیاتی نظام وجود میں نہیں آئے گا بلکہ مغرب کی معاشی اقدار ہی کو غلبہ حاصل ہوگا اور وہ بڑی حد تک ہو چکا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی اقدار ہمارے معاشرے پر غالب آ چکی ہیں جیسے:

۱۔ غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہو رہے ہیں جو نتیجہ ہے سرمایہ دارانہ سودی نظام کا اور اسلام کے معاشی نظام اور اس کے فلسفۂ عدم ترکیز دولت پر عمل نہ کرنے کا۔

۲۔ مہنگائی اور کساد بازاری سے مسلمان عوام بھوکوں مر رہے ہیں، غریب اور متوسط طبقہ پس رہا ہے۔

۳۔ غریبوں اور امیروں میں نفرت بڑھ رہی ہے اور معاشرتی عدم آہنگی فروغ پا رہی ہے۔

۴۔ عزت کا معیار دولت بن چکی ہے، قناعت اور توکل کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ حرص،

ہوس اور حسد عام ہو چکا ہے۔

۵۔ فراڈ، بددیانتی، رشوت، کرپشن سکہ رائج الوقت بن چکے ہیں۔

۶۔ راتوں رات امیر بننے کی خواہش اور اعلیٰ معیار زندگی کے لیے غیر شرعی اور غیر تعمیری مسابقت زوروں پر ہے۔

۷۔ بیماروں، معذوروں، والدین اور بزرگوں کی کفالت بوجھ بن چکی ہے۔

۸۔ مغرب کے دباؤ پر آبادی کم کرنے اور خاندانی منصوبہ بندی کے تحت بچے کم پیدا کرنے کی مہم حکمران چلا رہے ہیں۔

۹۔ زکوٰۃ وعشر کا نظام کاغذوں میں موجود ہے لیکن عملاً غیر مؤثر ہے۔

۱۰۔ سود سارے معاشی نظام میں خون کی طرح رواں ہے اور کوئی حکومت اسے ختم کرنے پر تیار نہیں۔

حل

۱۔ سطور بالا میں ذکر کی گئی برائیوں اور خامیوں کو اگر دور کر دیا جائے تو اصلاح کا راستہ کھل جائے گا۔

۲۔ یونیورسٹیوں کے شعبۂ اکنامکس میں اسلام کے معاشی نظام کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور مغرب کا معاشی نظام پڑھانے کے بعد اس کا اسلامی تناظر میں تنقیدی جائزہ بھی لیا جائے۔

دینی مدارس میں 'اسلام کے معاشی نظام' کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ طلبہ کو انگریزی پڑھائی جائے تاکہ وہ مغرب کے معاشی نظام کا مطالعہ اس کے اصل مآخذ سے کر سکیں اور مغربی معیشت کا جائزہ اسلامی تناظر میں لے سکیں۔

مسلم ماہرین معیشت کے سامنے یہ ٹارگٹ رکھا جائے کہ وہ مغرب کے نظام سرمایہ داری کی نقل کرنے کی بجائے اسلام کے معاشی نظام کی تشکیلِ نو کریں اور اس کا تفصیلی نقشہ

(Road Map) تیار کریں۔

۳۔ دینی قوتیں حکمرانوں کو قائل کرنے کی کوشش کریں کہ ترقی اور خوشحالی کا راستہ اسلام کی معاشی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے نہ کہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی پیروی میں۔ وہ خود بھی اس میں کردار ادا کرسکتی ہیں مثلاً:

i۔ معیشت کا بڑا حصہ پرائیویٹ سیکٹر میں حکومتی دست برد کے باہر کام کر رہا ہے۔ ان چھوٹے صنعتکاروں اور دکانداروں کو منظم کر کے ان کا ایک وسیع نیٹ ورک بنایا جاسکتا ہے اور اسے اسلامی معاشی اصولوں کے مطابق چلایا جاسکتا ہے۔

ii۔ زکوٰۃ اور عشر کے نظام کو پرائیویٹ سیکٹر میں منظم اور فعال کر کے بدر جہا بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

iii۔ سود کے خلاف تحریک کو معاشرے میں منظم کر کے اسے کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ سود صرف حکومتی سطح پر باقی رہ جائے۔

iv۔ ہر مسجد میں ایک 'رفاہی کمیٹی' بنائی جائے جو محلے کے کھاتے پیتے لوگوں سے پیسے اکٹھے کرے اور محلے کے یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور مسکینوں کی مالی مدد کرے تاکہ کوئی آدمی بھوک سے نہ مرے یا مانگنے پر مجبور نہ ہو۔

۴۔ دینی جماعتیں حکومت کو مجبور کریں کہ وہ ڈالر سے وابستگی ختم کردے، مسلم ممالک سے تجارت کو بڑھائے اور سب مسلمان ملک مل کر اسلامی کرنسی بنائیں۔

۵۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے قرض لینا بند کردیا جائے اور اپنے وسائل کے اندر زندہ رہنا سیکھا جائے۔

۶۔ مالیاتی نظام ایسا ہو کہ دولت کا رخ امیروں سے غریبوں کی طرف ہو۔

۷۔ مسلمان ملکوں کے تاجر مل کر ملٹی نیشنل کمپنیاں بنائیں

۸۔ امیر مسلمان ملک غریب مسلمان ملکوں کی مدد کریں

۹۔ بڑی صنعتوں کی بجائے کاٹیج انڈسٹری کو فروغ دیا جائے تا کہ بے روزگاری میں کمی واقع ہو اور دیہات اور چھوٹے شہروں سے بڑے شہروں کو انتقال آبادی کے رجحان کی حوصلہ شکنی ہو۔

معاشرت

معاشرت انسانی زندگی کا بہت اہم شعبہ ہے کیونکہ خاندان کا ادارہ، رسوم ورواج، شادی بیاہ، غم اور خوشی، نکاح، طلاق، وراثت، بچوں کی تربیت، ماں کا کردار وغیرہ اسی سے متعلق ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس شعبے پر بھی دوسرے شعبوں کی طرح، مغربی تہذیب وتمدن اور ہندو تہذیب وتمدن کے بہت سے اثرات ہیں اور یہ شعبہ دشمنانِ دین کی سازشوں کی آماج گاہ بنا ہوا ہے.... آج بھی مسلمان اپنی معاشرت میں، الحمدللہ، دوسری قوموں سے منفرد اور ممتاز ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں مسلمان اپنی معاشرت میں اسلامی تعلیمات پر کار بند رہیں اور مغربی تہذیب وتمدن (اور ہندو تہذیب وتمدن) سے مرعوب ومتاثر نہ ہوں اور نہ ان کی پیروی اور نقالی کا سوچیں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات ناگزیر ہیں:

❁ ہمارے ہاں میڈیا، خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کے لیے اخلاقی اصول وضع کیے جائیں جن کی پابندی لازمی ہو اور یہ اخلاقی اصول اسلامی معاشرت پر مبنی ہوں خصوصاً ٹی وی، فلم، ڈرامے، تھیٹر میں جو عوامی تفریح کا بڑا ذریعہ ہیں اور جو غیر اسلامی معاشرت کی ترویج میں بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ حکومت اور اس کے متعلقہ اداروں (مثلاً پیمرا) کا فرض ہے کہ وہ اس کے لیے کوڈ آف کنڈکٹ یا کوڈ آف ایتھکس تیار کرے اور اس پر سختی سے عمل درآمد کرائے۔ دینی قوتوں کا فرض ہے کہ وہ اس معاملے میں سستی اور غفلت سے کام نہ لیں بلکہ بیدار اور متحرک رہیں اور حکومتی اداروں اور عدالتوں پر دباؤ برقرار رکھیں تا کہ وہ اپنے

فرائض کی ادائی میں تساہل نہ برتیں۔ دینی قوتوں اور اداروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عوام کے لیے تفریح کے متبادل تعمیری پروگرام تیار کرائیں۔

❁ سطور بالا میں جو لائحہ عمل ہم نے الیکٹرانک میڈیا کے لیے تجویز کیا ہے، اس کا اطلاق سوشل اور پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات وجرائد اور ادب ناول، افسانے، ڈرامے، شعر پر بھی ہونا چاہیے۔

❁ نظام تعلیم وتربیت بھی اس میں اہم کردار ادا کرتا ہے لہٰذا تعلیم کی اصلاح بھی ضروری ہے اور مسلم معاشرے میں میوزک کلاسوں اور لڑکیوں کے لیے سوئمنگ پول یا آؤٹ ڈور کھیلوں سے احتراز ضروری ہے۔ تعلیمی اداروں میں کنسرٹ، فیشن شوز، مخلوط کھیلوں، مخلوط پکنک وغیرہ سے انتظامیہ کو بچنا چاہیے اور دینی قوتوں کو اس پر پہرہ دینا چاہیے۔

❁ عوام الناس اس طرح کے معاملات میں 'الناس علی دین ملوکھم' پر عمل کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر حکام، حکمران طبقے اور خوش حال لوگ معاشرت میں اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کریں تو ان کی دیکھا دیکھی عوام الناس بھی ایسا ہی کرنے لگتے ہیں لہٰذا حکمرانوں اور امیر طبقوں کے لیے اسلامی معاشرت پر عمل اور بھی زیادہ ضروری ہے۔

مبحث سوم: افراد وطبقات

حکمران/حکمران طبقے

پہلے بھی حکومتیں اور حکمران طاقتور ہوتے تھے اور جو چاہتے تھے کرتے تھے لیکن آج کی ریاست تو خدا بن بیٹھی ہے اور اس نے فرد کی ساری زندگی کو اپنے دائرۂ اختیار میں گھسیٹ لیا ہے۔ اس لیے آج کی ریاست اور حکمران تقریباً لامحدود اختیارات کے حامل

ہیں۔اس لیے حکمرانوں کا کردار آج کی ایک مسلم ریاست میں اسلامی زندگی گزارنے کے حوالے سے بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے لیکن جیسا کہ قارئین سطور سابقہ میں پڑھ چکے ہیں کہ اس کتاب میں خصوصی طور پر ہماری مخاطب دینی قوتیں ہیں اس لیے اس کتاب کے سارے مباحث انہی سے متعلق ہیں۔تاہم اس مبحث میں چونکہ ان سارے اداروں اور طبقات کا ذکر ہے جو اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے دوسرے طبقات کے ساتھ حکمرانوں کا ذکر کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

سطور سابقہ میں تعلیم، تزکیہ، میڈیا، مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ، فوج غرض سارے اداروں کا ذکر ہو چکا کہ ان میں کیا اصلاحات درکار ہیں لہٰذا ایک لحاظ سے ان سب کے مخاطب حکمران اور حکمران طبقے ہیں کہ جب اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو تو وہ ان اداروں میں وہ سب تبدیلیاں لائیں جو ہم نے ان کی ذیل میں ذکر کی ہیں۔

علماء کرام

علماء کرام کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت مسلم معاشرہ جس مذہبی شخصیت اور غیر مذہبی شخصیت یا مسٹر وملّا میں تقسیم ہے، کیا یہ تقسیم جائز اور صحیح ہے؟ اس سوال کو یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ کیا اس وقت علماء کرام کا معاشرے میں جو امیج اور کردار ہے وہ مطابق سنت ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ تدریس ایک قابل فخر پیشہ ہے اور دینی علوم کی تدریس تو اس سے بھی اعلیٰ تر ہے۔اسی طرح مسجد میں نماز کی امامت ایک اعلیٰ درجے کا معزز کام ہے لیکن جب سے مسلمانوں میں مسجد اور دنیا کی امامت الگ ہوئی ہے اور مسجدیں اوقاف کی بجائے عوامی کمیٹیوں کے زیر انتظام کام کرنے لگی ہیں اور دینی مدارس مسلمان حکومتوں یا اوقاف کے زیر انتظام نہیں رہے تو ان کو چلانے کے لیے علماء کرام کو خوش حال لوگوں سے چندہ مانگنا پڑتا ہے۔نیز دینی مدارس میں دنیوی علوم کی تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ دنیوی علوم وفنون کا تعارفی مطالعہ بھی نہیں کرایا جاتا۔اسی طرح سائنسی علوم وفنون اور ٹیکنالوجی تو رہے ایک طرف وہاں

عمرانی علوم (جیسے معاشیات، سیاسیات، ابلاغیات، سماجیات وغیرہ) کو بھی اسلامی تناظر میں نہیں پڑھایا جاتا حالانکہ ان کی تدریس اسلامی علوم ہی کی تدریس متصور ہونی چاہیے۔

ان سارے امور نے مل کر علماء کا امیج معاشرے میں خراب کر دیا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کا کام امراء اور خوشحال طبقوں سے چندہ مانگنا اور ان کے فراہم کردہ مالی وسائل پر گزارا کرنا ہے۔ انہیں عوام کے مسائل و مشکلات سے آگاہی نہیں ہوتی اور نہ وہ دیگر لوگوں کی طرح اس کا حصہ ہوتے ہیں۔

علماء کرام کا فرض ہے کہ وہ ان مسائل پر غور کریں اور ان کا حل سوچیں۔ دینی نظام تعلیم کی اصلاح کریں اور ماضی کی طرح بڑے اوقاف کی طرف آئیں۔ حکومت بھی ان معاملات میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے لیکن جس طرح کی ہماری حکومتیں ہیں ان سے کسی مثبت کردار کی توقع رکھنا عبث ہے لہٰذا دینی قوتوں کو خود ہی ان معاملات پر غور کر کے ضروری اقدامات کرنا ہوں گے۔

علماء کرام کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ جدید مغربی نظریات پڑھیں، سمجھیں، ان کا تنقیدی مطالعہ کریں اور انہوں نے معاصر مسلم معاشرے کے لیے جو مسائل کھڑے کیے ہیں، ان میں مسلمانوں کی رہنمائی کریں اور مغربی فکر و تہذیب کو علمی سطح پر ردّ کریں۔

معاشرتی تنظیم کے ذریعے کام

آج کل جو حالات ہیں ان میں علماء کرام کا یہ عذر قبول نہیں ہو سکتا کہ چونکہ ان کے پاس اقتدار نہیں لہٰذا وہ کیا کر سکتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ریاست بہت طاقتور ہے لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج ریاست میں سِول سوسائٹی کو بہت سے حقوق حاصل ہیں اور وہ غیر حکومتی تنظیموں (NGOs) کے ذریعے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحی کام کر سکتی ہے لہٰذا علماء کرام بھی اگر چاہیں تو پرائیویٹ سیکٹر میں

معاشرتی تنظیم کے ذریعے بہت کام کر سکتے ہیں مثلاً وہ:

شعبۂ تعلیم میں ہزاروں سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کر سکتے ہیں، ان کے نصاب میں بہتری لا سکتے ہیں، اساتذہ کی تربیت کے ذریعے ان میں اسلامی روح پیدا کر سکتے ہیں۔ ہر مسجد میں معمولی خرچ سے ایک پرائمری سکول قائم کیا جا سکتا ہے جہاں بچوں کو دینی تعلیم کے علاوہ عصری مضامین کی ابتدائی تعلیم بھی دی جا سکتی ہے۔ وہ دینی مدارس کے موجودہ نظام کو موثر بنا سکتے ہیں اور ان کے تیار کردہ افراد زندگی کے سارے شعبوں میں پھیل کر اسلامی انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

شعبۂ تربیت: علماء و صلحاء مل کر تربیت گاہوں کا جال پورے ملک میں پھیلا سکتے ہیں اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی تربیت دے سکتے ہیں۔

غربت کا خاتمہ: ہر مسجد میں ایک فلاحی کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جو محلے کے کھاتے پیتے لوگوں سے زکوٰۃ و عطیات جمع کرے اور محلے کے غریب، مسکین، یتیموں، بیواؤں کی مالی مدد کرے۔

امن و امان: ہر مسجد میں ایک امن و امان کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جو محلے کے نوجوانوں کے ذمے لگائے کہ وہ رات کو باری باری پہرہ دیں۔ بزرگ افراد مسجد آتے جاتے سٹریٹ کرائمز پر نظر رکھیں۔

ثالثی کمیٹی: ہر مسجد میں ایک مصالحتی و ثالثی کمیٹی بنائی جا سکتی ہے جس میں امام صاحب کے علاوہ کوئی ریٹائرڈ جج، بیوروکریٹ، نیک فطرت وکیل وغیرہ ہو۔ یہ لوگ بلا معاوضہ لوگوں کے درمیان صلح کرائیں، چھوٹے بڑے مقدمات سنیں تاکہ لوگوں کو اسلامی اصولوں پر انصاف دہلیز پر مل سکے۔ شہر کی سطح پر ان کمیٹیوں کے اوپر ایک اپیل کمیٹی بھی بنائی جا سکتی ہے۔

اگر ان کاموں کا پروپیگنڈا نہ کیا جائے، خاموشی سے کام کیا جائے تاکہ حکومتی ادارے

چوکنے نہ ہوں تو معاشرتی تنظیم کے ذریعے یہ کام بآسانی کیے جاسکتے ہیں اور فرد و معاشرے کی سطح پر اسلام عملاً نافذ ہوسکتا ہے۔

اساتذہ

ہمارے اساتذہ کی اکثریت یہ سمجھتی ہے، خواہ وہ پرائمری سکول کے اساتذہ ہوں یا یونیورسٹی سطح کے، کہ ان کا کام بس سبق پڑھا دینا (یا لیکچر دے دینا) ہے۔ انہوں نے سبق پڑھا دیا تو گویا انہوں نے اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داری پوری کر دی، ان کا رزق حلال ہوگیا اور اب وہ فارغ ہیں۔

حالانکہ قرآن حکیم کی رو سے معلم یا استاد مربی و مزکی ہوتا ہے یعنی اس کا کام صرف تعلیم دینا اور سبق پڑھا دینا ہی نہیں بلکہ طلبہ کی تربیت کرنا بھی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے ان کا کام طلبہ کے نفوس کا تزکیہ کرنا بھی ہے۔ اس تزکیے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اچھے اور باعمل مسلمان بن جائیں اور ظاہر ہے کہ دوسروں کے تزکیہ و تربیت کا یہ کام وہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ان کے اپنے نفس کا تزکیہ نہ ہو۔ گویا ایک مسلمان معلم کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پہلے خود اچھا مسلمان بنے اور پھر اپنے طلبہ و طالبات کو اچھا مسلمان بنائے۔ ان تعلیمی و تربیتی اداروں کی جو اساتذہ تیار کرتے ہیں، انہیں پڑھاتے اور ان کی تربیت کرتے ہیں، یہ ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں خود اچھا مسلمان بننے اور دوسروں کو اچھا مسلمان بنانے کا ہنر سکھائیں۔

بدقسمتی سے یہ دیکھا گیا ہے کہ آج کل کے اکثر اساتذہ کو تربیت کی اس ذمہ داری کا احساس ہی نہیں یا انہیں یہ بتایا ہی نہیں گیا لہٰذا ہر استاد کی یہ ذاتی ذمہ داری اور اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ و طالبات کو اچھا باعمل مسلمان بنائے اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس غرض سے وہ خود اچھا اور عملی مسلمان بننے کی جدوجہد کرے۔ اور یہ دونوں کام چونکہ عنداللہ مسئولیت کے ہیں لہٰذا اگر ان کے اندر یہ کمی ہے تو وہ اسے پورا کرنے کی کوشش کریں۔ مروجہ نصاب میں اگر اس چیز کی کمی ہے تو وہ اسے اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھ کر اس کمی کو

پورا کرنے کی کوشش کرے۔

دینی مدارس کے اساتذہ کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس فرض سے عہدہ برآ ہوں۔ دینی مدارس کے اساتذہ کے طلبہ کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے مخصوص اور منفرد مسائل ہوتے ہیں۔طلبہ اور اساتذہ دونوں دین کی معلومات تو رکھتے ہیں البتہ خوش دلی سے دینی تعلیمات پر عمل کرنے کی تربیت کی وہاں بھی ضرورت ہوتی ہے۔اسی طرح طلبہ کو فرقہ واریت سے بچانا مطلوب ہونا چاہیے تاکہ طلبہ دین اور مسلک میں فرق کو سمجھ سکیں اور دین کو اپنے مسلک میں محصور نہ سمجھیں۔انہیں جدید دنیا اور اس کے نظریات ومسائل سے آگاہ کرنا بھی استاد کا فرض ہے تاکہ وہ ہم عصر معاشرے کو سمجھ سکیں،اس کی رہنمائی کر سکیں اور اس کے مسائل کے قابل عمل حل پیش کر سکیں۔

طلبہ

ہر مسلمان نوجوان طالب علم کو اس کا حساس ہونا چاہیے کہ اس کا کام صرف کھیل کود نہیں ہے اور نہ نصابی کتب اور ان کی گائڈیں اور خلاصے اور اساتذہ کے نوٹس پڑھ کر اور رٹ کر امتحان پاس کر کے ڈگری لے لینا ہے۔اس طرح ڈگری لینے سے ملازمت تو ممکن ہے مل جائے لیکن تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوگا۔مسلم تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس سے معرفت نفس اور معرفت پروردگار حاصل ہوجائے۔اسے پتہ چل جائے کہ دنیا کی اس زندگی میں اس کا کردار کیا ہے؟ اور اس کا بنیادی فریضہ اللہ کا عبد ہونے کی حیثیت سے یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی اپنے خالق ومالک کی مرضی کے مطابق گزارے تاکہ دنیا وآخرت دونوں میں کامیابی اس کے قدم چومے۔اور اگر معاشرہ اس کا ہم نوا اور اس مقصد سے ہم آہنگ نہ بھی ہو تو وہ دنیا میں اطمینان قلب کی دولت سے متمتع ہوجائے اور دنیا کی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارنے میں جو تحدیات اور آزمائشیں اسے پیش آئیں وہ ان کا کامیابی سے سامنا کر سکے۔

طلبہ کو دورانِ تعلیم اپنی تمام توجہ علم کے حصول میں صَرف کرنی چاہیے۔ جہاں تک سیاسی اور دیگر سرگرمیوں کا تعلق ہے تو وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنی مرضی کی سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر سیاسی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہیں۔ یہی بات دینی جماعتوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ طلبہ کو دینی جماعتوں کے کارکن بن کر اپنے تعلیمی کیریئر کا ضیاع نہیں کرنا چاہیے۔

جدید تعلیم کے طلبہ کو اس امر کا بھی احساس ہونا چاہیے کہ عصری نظام تعلیم نہ ان کو دینی علوم کی تعلیم دے رہا ہے اور نہ ان کی دینی تربیت کر رہا ہے لہٰذا اس خلاء کو پورا کرنا ان کی ذاتی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح دینی مدارس کے طلبہ کو اس امر کا احساس ہونا چاہیے کہ ان کا نظام تعلیم ناقص ہے، نہ ان کو دنیوی علوم کی تعلیم دے رہا ہے اور نہ ان کو جدید فنون اور ٹیکنالوجی کا تعارفی مطالعہ کرا رہا ہے بلکہ جو 'دینی علوم' ان کو پڑھا رہا ہے وہ بھی عصری ضرورتیں پوری نہیں کرتے اور نہ انہیں مستقبل میں مسجد و مدرسہ میں کام کرنے کے علاوہ کسب رزق کی کوئی مہارت انہیں دے رہا ہے لہٰذا ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے انہیں خود ذاتی طور پر جدوجہد کرنا ہوگی۔

صوفیائے عظام

صوفیاء کا کام قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کرنا ہے۔ ماضی میں اہل علم اور محقق صوفیاء نے اس کے لیے جو قواعد وضوابط بر بنائے اجتہاد وضع کیے وہ نہ صرف قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق تھے بلکہ عملاً بھی نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوئے لیکن پھر بتدریج تصوف میں غیر اسلامی افکار اور رسوم ورواج داخل ہوتے چلے گئے جنہوں نے دورِ زوال میں اسے کرپٹ کر کے رکھ دیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ جو مربی آج لوگوں کے نفوس کے تزکیہ کا کام کرنا چاہتے ہوں وہ دین کے مستند عالم ہوں۔ ماہر علم النفس ہوں۔ ماضی میں امت میں اصلاحِ نفوس کا

کام جس طرح ہوا اس سے بخوبی واقف ہوں، جدید اور معاصر تہذیب نے لوگوں کے اذہان وقلوب پر جو اثرات ڈالے ہوں، ان سے بخوبی آگاہ ہوں تاکہ وہ جدید ذہن کی مشکلات اور التباسات کو سمجھ سکیں اور لوگوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔ انہیں تزکیۂ نفس کے قرآنی مفاہیم اور دین کے اس میں صحیح مقام، حیثیت، نوعیت اور طریق علاج کی بھی خبر ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بیعت، اذکار و اشغال اور خانقاہ کے نظام پر بھی سابقہ تجربات اور عصری ضرورتوں کے مطابق نظر ثانی کی جائے، اس کی تجدید کی جائے اور اس کام کو نئے خطوط پر منظم کیا جائے۔

دانشور، ادیب اور صحافی

دانشور قوم کا دل و دماغ ہوتے ہیں۔ ان کا فکر و تدبر قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اِس وقت حالت یہ ہے کہ ہمارے دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں کی اکثریت غیر اسلامی اور غیر پاکستانی افکار کی خوشہ چین ہے۔ چند دہائیاں پیشتر جب پاکستان میں سوشلزم کا غلغلہ تھا تو ان میں سے بہت سے لوگ اس صبح کاذب کے اسیر بلکہ اس کے مبلغ اور علم بردار تھے اور جب وہ نظریہ اپنے فطری تضادات کے سبب راکھ کا ڈھیر ہو گیا تو اِن ابن الوقتوں میں سے اکثر اب مغربی فکر و تہذیب کے گُن گانے لگے ہیں اور اخبارات و جرائد اور پرنٹ و سوشل میڈیا پر اپنے لادین اور اباحیت پسندانہ افکار پھیلاتے رہتے ہیں۔

بعض صحیح الفکر لوگ ایسے بھی ہیں جو خود تو بد عقیدہ اور بدخیال نہیں ہیں لیکن روزگار کی مجبوری کی وجہ سے ذرائع ابلاغ مثلاً ٹی وی چینل کے مالکان کے کہنے پر صحیح بات نہیں کہہ سکتے اور مالکان جو چاہتے ہیں وہی کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

دینی عناصر میں سے بہت سے لوگ ابھی تک ادب و ثقافت اور ذرائع ابلاغ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور نہ ان شعبوں میں ابلیسی قوتوں کا توڑ کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بندی کرنے اور اس پر عمل کرنے میں وہ دلچسپی لیتے ہیں حالانکہ ادب و ثقافت اور ذرائع ابلاغ جس طرح لوگوں کے قلوب و اذہان پر اثر انداز ہوتے ہیں اس کا اندازہ آج کے پاکستانی معاشرے

سے بخوبی ہو جاتا ہے جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دینی جماعتوں اور تحریکوں کی دہائیوں کی محنت کو پچھلے چند سالوں میں ٹی وی اور سوشل میڈیا نے پچھاڑ کر رکھ دیا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم و تربیت کا ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں صحیح فکر پروان چڑھے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ کے لیے اسلامی اور اخلاقی اصول وضع کیے جائیں اور حکومت ان پر سختی سے پابندی کرائے۔ عوام کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ ان اصولوں کی خلاف ورزی پر متعلقہ اداروں کو عدالتوں میں چیلنج کر سکیں۔ دینی جماعتوں اور اداروں کو ایسی کمیٹیاں بنانی چاہئیں جو ذرائع ابلاغ کی چوکیداری کریں۔ ایسے وفود تشکیل دیے جائیں جو ذرائع ابلاغ کے اداروں کے مالکان سے جا کر ملیں اور انہیں غیر اخلاقی پروگراموں سے روکیں۔ ضرورت پڑنے پر پُرامن احتجاجی عوامی مظاہرے اور پکٹنگ بھی کی جا سکتی ہے۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ جو ادارے اس کے تحت کام کرتے ہیں وہاں اسلامی اصولوں کی پابندی کی جائے اور غیر اسلامی اور غیر پاکستانی پروگراموں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

جج اور وکلاء

پاکستان بننے کے بعد چونکہ معاشرے کی اسلامی تشکیلِ نو کا کام کسی نے نہیں کیا لہٰذا نہ قانون کی تعلیم کی اصلاح ہو سکی، نہ وکلاء اور عدلیہ کے کام کی اصلاح زیرِ بحث آئی اور نہ ججوں کی اسلامی شریعت سے واقفیت اور مہارت کے مسئلے پر کسی نے غور کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے لاء کالجوں میں، خواہ وہ پرائیویٹ سیکٹر میں ہوں یا پبلک سیکٹر میں، اسلامی قانون کا صرف ایک پرچہ ہوتا ہے جس میں ابتدائی باتیں اور اصطلاحات وغیرہ بتا دی جاتی ہیں۔ نہ عربی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے اور نہ قرآن و سنت کے احکام کا اور فقہ و اصول فقہ کا گہرا مطالعہ کرایا جاتا ہے۔ جب قانون کے طالب علموں کو شریعت کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی تو ظاہر ہے وکلاء اور جج بھی شرعی قانون سے ناواقف ہوتے ہیں اور فیصلے مغربی قانون اور

آئین کے مطابق کرتے ہیں نہ کہ قرآن وسنت کے مطابق۔ نہ آئین میں صراحت سے یہ ذکر ہے کہ فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کیے جائیں اور ہر وہ فیصلہ کالعدم تصور ہوگا جو قرآن وسنت کے خلاف ہوگا۔ نہ ججوں میں یہ اہلیت ہے کہ وہ فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کریں، نہ وکلاء میں یہ اہلیت ہے کہ وہ ججوں کو قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کرنے میں مدد کریں۔ ان کا کردار یہ ہے کہ وہ اپنے کلائنٹ کو سزا سے بچائیں خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ اس کے لیے بھاری بھر فیس وصول کرتے ہیں اور یہی ان کا پیشہ اور کاروبار بن چکا ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ عدالتی نظام کو مغربی فکر وتہذیب کے چنگل سے نکالا جائے۔ قانون کی تعلیم میں جدید قوانین کے ساتھ قرآن وسنت اور فقہ واصول فقہ کا حصہ غالب ہو۔ آئینی وقانونی ڈھانچے میں بھی قرآن وسنت کی حتمی بالادستی کو یقینی بنایا جائے۔ وکلاء اور مفتی کے کردار کو یکجا کیا جائے۔ وکلاء اور ججوں کی اسلامی اصول واقدار کے مطابق تربیت کی جائے اور ان میں قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کرنے اور کروانے کی اہلیت اور جذبہ پیدا کیا جائے۔ جب تک ریاستی سطح پر مذکورہ تبدیلیاں نہیں لائی جاتیں، وکلاء اور جج حضرات کا ذاتی، شرعی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اپنے طور پر اسلامی شریعت کا گہرا مطالعہ کریں تاکہ وہ خلاف شریعت فیصلے کرنے اور کروانے کے گناہ میں شرکت سے بچ سکیں۔

قارئین سے درخواست

قارئین کرام!

کتاب آپ کی نظر سے گزری۔ قلم اٹھایئے اور اس پر تبصرہ کیجیے۔ اس کے بارے میں

اپنی رائے لکھیے....تا کہ خرد افروزی کا سفر کچھ تو طے ہو۔ ہمیں سوچنے، رائے قائم کرنے اور اس کے اظہار کی کچھ تو عادت پڑے۔

خصوصاً ہم اہلِ علم وفضل اور اصحاب دانش سے گزارش کریں گے کہ وہ ہمیں اپنے تاثرات سے آگاہ کریں۔ ہماری آراء پر تنقید کریں، یا اپنی تجاویز اور مشوروں سے نوازیں، شکریہ۔

محمد امین

ڈاک کا پتہ: A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54700
موبائل: 0300-4354673 [برائے میسج (SMS) اور واٹس ایپ (WhatsApp)]
ای میل: ermpak@hotmail.com